اِنتہائے شب

پرتوؔ روہیلہ

حریمِ دیدہ و دل میں حطیمِ خاطر میں
وہ گونجتا ہے سدا انتہائے شب کی طرح

اِنتہائے شب

(شاعری)

پرتوؔ روہیلہ

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-291-7

کتاب	:	انتہائے شب
شاعر	:	پرتو روہیلہ
موسم اشاعت	:	2008
سرورق	:	خالد رشید
پسِ ورق (تصویر)	:	اختر مرزا
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	300.00 روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2 ، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

فون: 5-051-4102784 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

افتخار عارف

کے نام

ترتیب

ہُنر مند تخلیق کار

پرتو روہیلہ کے دوہوں نے مجھے اس لحاظ سے ہمیشہ متاثر کیا کہ وہ ان دوہوں میں جو زبان استعمال کرتا ہے، اسی کے مطابق فضا تخلیق کرتا ہے اور انہی علامتوں اور استعاروں کو کام میں لاتا ہے جو اس فضا کے لیے اجنبی نہیں بلکہ اس کا حصہ ہیں۔ مگر جب میں نے اس کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کیا تو یہ بھید کھلا کہ وہ تو کئی اور پہلوؤں سے بھی نہایت ہنر مند تخلیق کار ہے۔ اس نے دوہوں کی زبان دوہوں کے لئے رہنے دی ہے اور نظموں غزلوں کی لفظیات میں اپنے انفرادی اضافوں کے ساتھ ساتھ اسی اسلوب کی پاسداری کی ہے جو ان اصنافِ سخن کے ساتھ خاص ہے۔ یوں اس کے ہاں زبان و بیان کا تنوع حیرت انگیز ہے مگر یہ تنوع محض زبان پر اس کی گرفت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے موضوعات میں بھی بلا کا تنوع ہے اور اس نے یہ تنوع اس زندگی کے تنوع سے اخذ کیا ہے جس کا بھرپور اور ہمہ جہت مشاہدہ و مطالعہ اس کے فن کی پہچان بن گیا ہے۔ اُردو میں کم ہی شعراء کے ہاں موضوع و اسلوب کا اتنا بھرپور تنوع دستیاب ہے۔ ان معنوں میں پرتو روہیلہ کی فنی حیثیت منفرد ہے۔

زندگی کے سفر میں جن تجربات میں سے وہ گزرا ہے انہیں اس نے اپنے فن میں بڑی سلیقہ مندی اور ہنروری سے کھپایا ہے۔ اس کے تجربات محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تجربات بنیادی انسانی جذبات واحساسات کے علاوہ گردوپیش کے حالات اور ان کے افق تا افق پھیلے ہوئے اثرات تک حاوی ہیں۔ چنانچہ وہ ان شعراء کی صف میں بالکل الگ کھڑا نظر آتا ہے جو اپنی

ساری تخلیقی عمر کسی ایک جذبے، کسی ایک احساس، کسی ایک منظر کے گرد گھومنے منڈلانے میں گزار دیتے ہیں اور یوں تکرار کے مرتکب ہو کر اپنے فن کو محدود اور بے رس کر ڈالتے ہیں۔ پرتوؔ کا فن انسانی زندگی کی بوقلمونی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے ہاں مشاہدات و تجربات کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کہیں نہیں دہراتا۔

وہ ایک عالم نورد بھی ہے، شکاری بھی ہے اور اس کے پاس ایک ایسا منصب بھی ہے جس کے ذریعے وہ انسانی نفسیات کا مطالعہ نہایت قریب سے کرنے کا اہل ہے۔ پھر وہ بے حد غیر متعصب اور وسیع القلب انسان ہے اس لیے اس کے مشاہدے میں کہیں بھی جھول محسوس نہیں ہوتا اور اظہار کا یہ عالم ہے کہ وہ خالص ہندی اور خالص اُردو زبان کی نزاکتوں سے کام لینے کے علاوہ بعض پشتو اور پنجابی الفاظ بھی اتنی بے ساختگی اور روانی سے استعمال کر جاتا ہے کہ وہ اُردو کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یوں وہ ایک طرح سے مستقبل کی اُردو کی صورت پذیری کا اہم کام بھی انجام دے رہا ہے کہ پاکستان کی اُردو دوسری پاکستانی زبانوں یعنی پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، بروہی، سرائیکی اور کشمیری زبانوں کے بعض لفظوں، بعض محاوروں بلکہ بعض تیوروں کو اپنے اندر کھپا کر ہی یہاں کی قومی زبان کا اعزاز حاصل کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی پرتوؔ روہیلہ کے فن کا کردار نہایت مثبت ہے۔

پرتوؔ کا موضوع فن زندگی اور اس کی جزئیات ہیں۔ اس زندگی میں جنس بھی شامل ہے، ہجر و وصال کی کیفیتیں بھی ہیں وطن کے ساتھ غیر مشروط محبت بھی ہے اور ہمہ وقت کا یہ احساس بھی کہ وہ تخلیق کر رہا ہے جس کی اوّلین شرط جمال اور ساتھ ہی ابلاغ ہے۔ چنانچہ وہ ''لندن سے مانچسٹر جاتے ہوئے'' کے عنوان سے نظم لکھ رہا ہو یا اس کی نظم کا عنوان ''پن کشن'' ہو، وہ اپنے فنی اور تخلیقی منصب کو ایک پل کے لیے بھی فراموش نہیں کرتا اور یوں فن پارے پر فن پارہ تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک پرتوؔ پہنچا ہے، وہ اس کی آخری منزل نہیں ہے۔ اس کے اندر آگے بڑھنے کی لگن بھی ہے اور توانائی بھی، اور اس کا ثبوت اس کا دوہوں سے ''آواز'' تک کا سفر ہے۔ اس سفر کے ہر مرحلے پر وہ اپنی شخصیت میں کسی نہ کسی حسن کا اضافہ کرتا آیا ہے اور ''آواز'' کی بعض گھمبیر نظمیں گواہ ہیں کہ اس کا سفر جاری ہے، چنانچہ وہ اس فکر میں غلطاں ہے:

کس نے میرے سوچ بدن کو پہنایا احرام؟

اور

اک پل سے کیوں بڑھے نہ آگے پھولوں کی مسکان؟

اور

چندر ماں کے ٹکڑے جب میں دھرتی اوپر دیکھوں
میری من کٹیا میں بیٹھا کون پڑھے قرآن؟

کہیں کہیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کچھ زیادہ ہی براہ راست انداز میں کہہ رہا ہے اس کے دو سبب ہیں۔ اول تو اس نے بعض اہل نقد کے اس کلیے کی عملاً نفی کر دی ہے کہ شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے پرتو کی متعدد نظمیں اس نوعیت کی ہیں جیسے وہ خود کلامی میں مصروف ہے یا پھر ہم سب سے گفتگو کر رہا ہے اور گفتگو کی زبان ترکیبوں اور اصطلاحوں سے عملاً مبرّا ہوتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے باطنی اور ظاہری مظاہر کو نظر انداز کرنا اس کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ لاینحل ابہام ان شعرا کے ہاں پیدا ہوتا ہے جو زندگی کے کھرے پن یا کھردرے پن سے کتراتے ہیں اور مخمل و دیبا کی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ پرتو کی ساری شاعری اس کی ذاتی واردات کا اظہار ہے اور یہ اظہار بے تکلفانہ اور بے ساختہ ہے۔ مگر یہ بے تکلفی اور بے ساختگی ایک مہذب اور کلچرڈ انسان کی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ یوں وہ کٹر حقیقت پسند ہے مگر جب اس حقیقت کو شاعری کا لباس پہناتا ہے تو تخلیقِ جمال کے تقاضوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اس کا براہِ راست انداز دراصل براہِ راست دِل میں اُتر جانے کا انداز ہے۔

پرتو کسی بھی مرحلے پر یہ نہیں بھولا کہ وہ کس دَور میں زندہ ہے اور اس کے گرد و پیش سیاسی، معاشی معاشرتی اور ثقافتی سطح پر کیا کیا قیامتیں برپا ہیں۔ چنانچہ عصری آگہی اس کی تخلیقات میں خون کی طرح رواں رہتی ہے اور شاعر کی عصری آگاہی اسے جذبوں کی نزاکتوں کی نفی پر مجبور نہیں کرتی بلکہ اس کے جذبے کو زیادہ مہذب بناتی ہے۔ اس کی گواہ پرتو کے دوہوں اور غزلوں کے علاوہ اس کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں پرتو ایک متلاشی، ایک متجسس شاعر کی صُورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس

تلاش و جستجو نے اسے مایوس کہیں نہیں کیا، البتہ عصر حاضر نے کاروبارِ حیات میں انسان کو جو نا قابل رشک حیثیت دے رکھی ہے، اس پر وہ اُداس ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ اُداسی اسے جگہ جگہ حیرت زدہ کر دیتی ہے اور حیرت وہ مقام ہے جو انسان کو بے بس کر دینے کی بجائے اسے کھوجنے اور کریدنے پر آمادہ کرتا ہے اور ہمارا یہ ذہین اور خود آگاہ شاعر تا حال اسی کیفیت میں سے سر برآوردہ انداز میں گزر رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

حمد

شبِ ازل دمِ اعجاز کُن فکاں تجھ سے
ضمیرِ ہست میں نقشِ طلسمِ جاں تجھ سے

دھڑک رہا ہے اگر دل تو اِذن ہے تیرا
حریمِ جاں میں جو گونجی ہے تو اَذاں تجھ سے

حطیمِ فکر جو روشن ہے تیرے نام سے ہے
مرے دہن میں ہے گویا تو یہ زباں تجھ سے

ترے سبب ہیں جزا و سزا کے سب قصّے
امید و بیم کی ہر ایک داستاں تجھ سے

مرے تمام ارادوں میں تیری مرضی ہے
مرے ہر ایک عمل کا ہے امتحاں تجھ سے

مرے گمان کے ہر مرحلے کا تو رہبر
مرے یقین کی منزل کا ہر نشاں تجھ سے

تمام فکر و تفکّر کی انتہا تُو ہے
تمام حرف و حکایت ہے درمیاں تجھ سے

مکاں کی حد بھی تصوّر سے میرے باہر ہے
میں کیا کہوں متصوّر ہے لا مکاں تجھ سے

یہ ہست و بود کی نیرنگیاں پکارتی ہیں
بہار تجھ سے، خزاں تجھ سے، گلستاں تجھ سے

بسانِ بسترِ سنجاب، آتشِ نمرود
بشاخِ برق، یہ توفیقِ آشیاں تجھ سے

تری رضا سے بشر عرشِ پاک پر پہنچا
زمیں سے تا بفلک طرحِ نردباں تجھ سے

وہ ذاتِ خاص جسے تُو نے فیضِ قرب دیا
فنا پذیر تھی، لیکن ہے جاوداں تجھ سے

کہاں ہے راکبِ نوری جو رات گزرا تھا
سوال بن کے مخاطب ہے کہکشاں تجھ سے

مرے شَرف کے لیے کیا یہ مرتبہ کم ہے
فلک پہ جا کے ہو انسان ہمزباں تجھ سے

ظن و گماں کی تمازت سے ہو گیا ثابت
مرے یقین کا محفوظ سائباں تجھ سے

سپاسِ ہدیۂ جاں ہو ادا تو کیسے ہو
بغیر مانگے جو پاؤں یہ ارمغاں تجھ سے

طلوعِ صبح، اندھیروں میں آرزو تیری
مری تلاش کا ہر گنجِ شائگاں تجھ سے

ترے جہان میں خوشبو تو ہے تری لیکن
نجانے دور ہے کتنا ترا مکاں تجھ سے

تمام جسم میں گردش تری لہوٗ بن کر
چھلک رہا ہے یہ لیوانِ ارغواں تجھ سے

مرے خیال کو تجھ سے مفر نہیں ہرگز
زمین بھی مری تجھ سے ہے، آسماں تجھ سے

ہے میرے شوق کو مہمیز بندگی تیری
مرے نیاز کی جولانیاں جواں تجھ سے

ترا کرم کہ ہوا ہے مکاں مکاں مجھ پر
مرے گلے کہ رہے ہیں زماں زماں تجھ سے

میں اپنی کون سی مشکل عیاں کروں تجھ پر
مرے خیال کا در، کون سا نہاں تجھ سے

میں اپنا نفس گزیدہ، سکونِ دل کے لیے
ہجومِ کرب میں مانگوں تو بس اماں تجھ سے

تمام عمر تری پیشگاہ میں گزری
خدا ہی جانے ملوں گا تو اب کہاں تجھ سے

نعت

حدِّ خرد سے ماورا اُس کے کمال کا حساب
روزِ ازل ہی جو ہوا، خالقِ کُل کا انتخاب

رازدروں سے باخبر لوح و قلم کا کارداں
دیکھا نہ جس نے مدرسہ، اس پہ نزولِ الکتاب

مالکِ کُل نے ایک شب اپنے حبیبِ پاک کو
خود ہی بُلا کے عرش پر، توڑ دیے سبھی حجاب

تا نہ ہوا زمین پر اُس مہِ نور کا ورود
قلزمِ حسنِ ذات سے اُٹھّی نہ موجِ اضطراب

قطرۂ بے وقار کو جس نے محیط کر دیا
ہو گئے محوٗ ریت میں کینہ و جہل کے سراب

جس کا کلام پھیر دے چہرۂ جہلِ کافراں
چیر دے ظلمتوں کے دَل جس کی نگاہِ خوش خطاب

قریۂ راستی کا اک سالکِ بے نوا و برگ
عالمِ ہست و بود کا نام پہ اس کے انتساب

بے بَصَر آنکھ کے لیئے اُس کا وجود روشنی
اُس کا ورود رات میں رشکِ طلوعِ ماہتاب

کون و مکاں کے حسن کو اس کے جمال سے ثبات
قدموں سے رنگِ کہکشاں، ماتھے سے نورِ ماہتاب

کون بجز علیمِ کُل، سمجھے گا اس کا مرتبہ
بیٹی ہو جس کی فاطمہؓ بھائی ہو جس کا بوتراب

ذات سے اس کی متصّل دونوں جہاں کی برکتیں
اس پہ درُود بھی صلوٰۃ، اس پہ سلام بھی ثواب

نعت

یہ کیسی نعت ہے، پھر کیسے التزام کے ساتھ
خدا کا نام بھی شامل ہے اُنؐ کے نام کے ساتھ

میں ایسی ذات کی مدحت کروں تو کیسے کروں
خدا نے نام لیا جس کا احترام کے ساتھ

سعادتِ بشری کا وہؐ اسمِ اعظم ہیں
تمام عظمتیں منسوب اُنؐ کے نام کے ساتھ

درود لب پہ مرے ہو جب انؐ کا نام آئے
حضورِ روضۂ اقدس ہوں میں سلام کے ساتھ

اگر وہاں مرا اک شعر بار پاجائے
تو سرخرو عجمی بھی ہو اِس کلام کے ساتھ

مرے قلم کو عطا اذنِ نعت گوئی ہو
یہ لطفِ خاص بھی آقا ہو اِس غلام کے ساتھ

اگرچہ وحی نہیں، ہے اُسی قبیل کی چیز
یہ روشنی کہ اترتی ہے مجھ پہ شام کے ساتھ

نعت

دیکھ پاؤں جو خدایا تو میں کیا کیا دیکھوں
تجھ کو دیکھوں کہ ترے نور کا سایا دیکھوں

آرزوئیں ہیں کہ بے چین کیے رکھتی ہیں
شوق کہتا ہے دیارِ شہِ بطحا دیکھوں

اپنے پیکر میں سماتا نہیں قطرے کا وجود
منبعِ حق کو پکارے ہے کہ دریا دیکھوں

مجھ پہ روشن ہوں مدینے کی مقدّس گلیاں
کہکشاں پر شہِ لولاک کو چلتا دیکھوں

چار سو آپ کے بیٹھے ہوں صحابہ سارے
گردِ مہتاب اُسی نور کا ہالہ دیکھوں

کچّے دروازے سے خورشیدِ رسالت ابھرے
روئے آفاق جو پھیلے وہ سویرا دیکھوں

میں تصدّق کروں اک عمر کی بیداری کو
اک گھڑی خواب میں گر آپ کا چہرہ دیکھوں

اپنی آنکھوں کو بچھا کر سرِ راہِ محشر
میں شفاعت کے لیے آپ کا رستا دیکھوں

دل یہ کہتا ہے کہ بس صحنِ حرم میں پرتوؔ
بیٹھا خاموش فقط گنبدِ خضرا دیکھوں

نعت

اِس میں شامل ہے رضا و کرم عزّ و جل
ہر عبادت سے درود آپؐ کی اعلیٰ افضل

آپؐ کے اسم سے ہیں لفظِ جہاں میں معنی
ورنہ یہ دفترِ صد رنگ و نمو بس مہمل

شفقتیں آپؐ کی ہر گوشۂ گیتی پہ محیط
رحمتیں آپؐ کی دنیا پہ برستا بادل

آپؐ کی دین سے دنیا کو شرَف کی منزل
ظلمتِ دہر میں ہیں آپ ہی حق کی مشعل

آپؐ یکتائے زمانہ ہیں وہ سلطاں جس کا
کوئی نقّارہ نہ دربار نہ قلعہ نہ محل

آپؐ کی بات بشر کے لیے اسمِ اعظم
وجہِ تقلیدِ جہاں آپؐ کا ہر ایک عمل

یوں تو ہم سب کے لیے آپؐ ردائے رحمت
نسب و مِلک کا عورت پہ جو ڈالا آنچل

آپؐ کے فَرق پہ قرباں یہ گُلِ جانِ عزیز
آپؐ کے پاؤں کے نیچے مری آنکھوں کے کنول

آرزو ہے کہ یہ بڑھ کر بڑا چھتنار بنے
آپ کے پیار کی پھوٹی ہے جو دل میں کونپل

اک عنایت کی نظر مجھ پہ بھی آقائے جہاں
اک اشارہ مری بخشش کا بھی مولائے مِلل

اک جھلک روئے مبارک کی بھی ارزانی ہو
زندگانی مری بے برگ ہے ہو جائے سپھل

میں بھی منجلۂ اجرامِ محبت ہو جاؤں
آفتابِ افقِ خیر، مجھے بھی اک پل

اک تمنّا ہے کہ بس اتنی سعادت مل جائے
روضۂ پاک پہ روتا ہوں کہ آ جائے اجل

نعت

قربِ حق مانگوں نجاتِ غمِ دنیا مانگوں
میں سمجھتا نہیں کیا کیا شہِ بطحا مانگوں

ڈوبتے دل کے لیے سایۂ محرابِ حرم
بجھتی آنکھوں کے لیے گنبدِ خضرا مانگوں

اپنے جینے کے لیے مانگوں میں صحنِ کعبہ
اپنے مرنے کے لیے خاکِ مدینہ مانگوں

عشق میں آپ کے بہتے رہیں آنسو میرے
میں وہ قطرہ ہوں کہ مانگوں بھی تو دریا مانگوں

میں کہ ہر لحظہ ہلاکت کی کڑی دھوپ میں ہوں
دامنِ رحمتِ کونین کا سایہ مانگوں

آپ کا چہرۂ انور متصوّر ہو جائے
ربِّ کعبہ سے حضوری کا وہ سجدہ مانگوں

ہوں بصارت کے سرابوں میں پریشاں پرؔتو
آپؐ سے نورِ ازلؔ دیدۂ بینا مانگوں

○

کب تابِ دید ہے کہ نظارہ کرے کوئی
نیرنگیِ جہاں کا تماشا کرے کوئی

ہر لمحہ ایک گھونٹ کسی کی جدائی کا
کیوں تلخیٔ حیات گوارا کرے کوئی

کِن مرحلوں سے گزری ہے اب تک ہوائے زیست
بیٹھا کنارِ آب یہ سوچا کرے کوئی

خورشید بھی جو ابھرے تو بڑھتی ہیں ظلمتیں
ایسی شبِ سیہ کا سویرا کرے کوئی

ہر آرزو کہ ایک غزالِ رمیدہ ہے
کِس کِس کا دشتِ شوق میں پیچھا کرے کوئی

عالَم ہے ایک مقبرۂ خوبی و صفات
کب تک مزارِ ذات پہ رویا کرے کوئی

فرصت کہاں کہ لوحِ تصوّر پہ تیرا نقش
مژگانِ آرزو سے سنوارا کرے کوئی

اس دورِ انتشار میں ممکن نہیں رہا
پرتوِ خیالِ یار بھی یکجا کرے کوئی

○

اُداس رات میں صحرائے ہُو پکارتا ہے
مرے حبیب کہاں ہے جو تُو پکارتا ہے

یہ گونج ہے مری تنہائیوں کی یا کوئی
دیارِ شب میں مجھے کوبکو پکارتا ہے

بہا کیا ہے سرِ خاکِ شور لیکن اب
نموئے ذات کو میرا لہو پکارتا ہے

ہر ایک سانس پہ ہوتا ہے مجھ کو یہ احساس
مصاف کے لیے میرا عدو پکارتا ہے

اُدھر ہے کوکبۂ علم و آگہی روکش
اِدھر یہ جلسۂ جام و سبو پکارتا ہے

میں آج تک اسے پہچان بھی نہیں پایا
کچھ اس فریب سے وہ حیلہ جُو پکارتا ہے

○

تخلیق کے ہر فن میں سِوا دیکھئے ہم کو
منصب پہ خدائی کے بٹھا دیکھئے ہم کو

پہنائیِ امکاں میں ہیں مٹّی کی نمو ہم
آساں ہو تو پتھر سے دبا دیکھئے ہم کو

ہم خاطرِ دوراں میں ہیں بیداریٔ ساعت
ممکن ہو تو اک لمحہ سُلا دیکھئے ہم کو

حلّاج کا خوں ہے یہ اناالحق ہی کہے گا
سولی پہ شریعت کی چڑھا دیکھئے ہم کو

خاکسترِ دیشب ہی سے ابھریں گے ہمیشہ
امروز کی بھٹّی میں جلا دیکھئے ہم کو

سقراطِ زمانہ ہیں سدا حق ہی کہیں گے
جس دور میں سَم چاہے پلا دیکھئے ہم کو

ہم خاک بھی ہوتے ہوئے مائل بہ فلک ہیں
چٹکی میں ذرا لے کے اڑا دیکھئے ہم کو

قندیل کی صورت سے بکھیریں گے ضیائیں
محرابِ محبت میں سجا دیکھئے ہم کو

ہم خاطرِ انساں میں ضمیرِ ابدی ہیں
موہوم سی جنبش سے جگا دیکھئے ہم کو

ہم صفحۂ ہستی پہ ابھر آئیں گے ہر بار
سو بار اگر چاہیں مٹا دیکھئے ہم کو

ہر سانس میں مہکیں گے سدا مشک کی صورت
اک بار ذرا دل میں بسا دیکھئے ہم کو

○

چرخِ گرداں کی محبت جو مری خاک میں ہے
میری توقیر بھی دستار کے پیچاک میں ہے

آج تک مجھ کو زمیں پر نہیں رہنا آیا
دھوم ورنہ مرے ہونے کی تو افلاک میں ہے

ایک جھونکے سے ہوا کے یہ بھڑک اٹھتا ہے
کوئی شعلہ تو چھپا تودۂ خاشاک میں ہے

جان جائے تو ملے اس کو اذیّت سے نجات
ایک مجروح کبوتر کفِ سفّاک میں ہے

تو کرے گا بھلا اب کون سی اقلیم شکار
سارا عالم جو ترے گوشۂ فتراک میں ہے

تیری مژگاں کا وہ بھولا ہوا بے چین خیال
گویا کانٹا سا کھٹکتا کہیں پوشاک میں ہے

ایک افسانہ کہ تاریخ نے لکھّا ہے سدا
اک حقیقت کہ جو ہر دیدۂ نمناک میں ہے

اپنی جاگیر تو آزادیٔ افکار ہی تھی
اب نظر آتا ہے وہ بھی تری املاک میں ہے

ایک فردوسِ مسرّت ہے کہ بس جس کا نشاں
طفلِ خورسند کے، گُل خندۂ بیباک میں ہے

قعرِ پستی سے ابھرنے نہیں دیتا مجھ کو
نقص ایسا کہیں پرؔتو مرے ادراک میں ہے

○

مرا وجود تھا آوازِ زیرِ لب کی طرح
بساطِ وقت پہ اک آہِ بے سبب کی طرح

حریمِ دیدہ و دل میں حطیمِ خاطر میں
وہ گونجتا ہے سدا انتہائے شب کی طرح

مجھے بھی ساتھ ہی لے چل ہوائے کوئے سحر
کہ جل رہا ہوں چراغِ وداعِ شب کی طرح

حکایتیں بھی کہے اور پھر رہے خاموش
تمہاری آنکھ کی صورت تمہارے لب کی طرح

جمالِ یار بھی اقصائے کائنات میں تھا
شبِ فراق میں گویا مری طلب کی طرح

میں اپنی ذات میں یکتا و منفرد پرتوؔ
مرا کلام بھی کیسے ہو اور سب کی طرح

○

تجسیمِ رنگ و نور کا منظر نظر تو آئے
روئے زمیں بھی چاند کا پیکر نظر تو آئے

کیوں کر یقین آئے سحر کی نوید پر
اِس رات کی فصیل کے باہر نظر تو آئے

کیا جانئے کدھر سے نکلتا ہے آفتاب
مغرب کی قید و بند میں خاور نظر تو آئے

کِس سمت جا رہے ہیں محبت کے قافلے
اُڑتا ہوا ہَوا میں کبوتر نظر تو آئے

ٹوٹے تو تشنگی کا کسی طرح سے طلسم
اے ریگ زارِ شوق، سمندر نظر تو آئے

پرتو میں سارے خواب محل اُس پہ وار دوں
مجھ کو سکوں کے سایے میں اک گھر نظر تو آئے

○

ہائے مرگِ تنہائی! محفلوں نے آ گھیرا
جان کے نکلتے ہی دوستوں نے آ گھیرا

چھوڑ جائے گی تُو بھی، رات کے اندھیروں میں
صبح کے اُجالے میں وسوسوں نے آ گھیرا

چونک چونک پڑتا ہوں، خواہشوں کے بستر پر
یاد کے دریچے کو دستکوں نے آ گھیرا

کل کی دھوپ میں مجھ سے سایہ بھی گریزاں تھا
آج سائباں نیچے مخلصوں نے آ گھیرا

چاہتوں کی سرگوشی کھُل گئی مشیّت پر
قربتوں کی آہٹ پر فاصلوں نے آ گھیرا

دشت کے مسافر کو تھا قلق تو بس یہ تھا
جاں کنی سے پہلے ہی، کرگسوں نے آ گھیرا

چھوڑیئے کہاں جا کر، اب جنوں کے چھالوں کو
کوہ و راغ و صحرا کو بستیوں نے آ گھیرا

دست بُردِ شحنہ سے دیکھیں کون بچتا ہے
کم سواد حاکم کو، خادموں نے آ گھیرا

میری پارسائی بھی جامۂ کتاں نکلی
بزمِ شعر میں جب کل، مہوشوں نے آ گھیرا

سوچتے تھے ہم پرتو سیرِ گل کا موسم ہے
گھر سے باہر آتے ہی، آندھیوں نے آ گھیرا

○

رہتا ہے مرا اپنا سراپا مرے آگے
بہتا ہے مرے خون کا دریا مرے آگے

وحشت مرے افکار کی رہتی ہے عَقب میں
اعمال کا گھومے ہے بگولا مرے آگے

میں تھک کے سرِ راہِ طلب بیٹھ نہ جاؤں
دنیا مرے پیچھے ہے، تو عقبیٰ مرے آگے

خوابوں میں جسے دیکھ کے کاٹی تھیں یہ راتیں
اے کاش کہ ہوتا وہ سویرا مرے آگے

ظلمت ہی اُگلتا ہے ہمیشہ مرا سورج
مشرق میں بھی رہتا ہے اندھیرا مرے آگے

میں آخری سانسوں پہ ہوں اور سوچ رہا ہوں
اب کون سا آتا ہے مسیحا مرے آگے

اس بات سے پرتو مرے امروز کا سوچو
پیچھے کی طرف بھاگے ہے فردا مرے آگے

○

اب تو چلنا بھی تری راہ میں مشکل ٹھہرا
اے دِل زار ترا درد ہی منزل ٹھہرا

تُو نے فرقت میں سدا انجمن آرائی کی
عینِ تنہائی میں بھی صورتِ محفل ٹھہرا

تُو نے کیوں عربدہ جوئی پہ کمر باندھی ہے
میں تو تیرے ہر اک انداز کا قائل ٹھہرا

اتنی دیرینہ رفاقت بھی ہوئی بے معنی
خون کا ایسا رواں رشتہ بھی باطل ٹھہرا

تُو ہی اب ترکِ تعلّق پہ مصر لگتا ہے
تُو جو ہر لمحہ مری سانس میں شامل ٹھہرا

میرا ہمدم ہی بجھانے لگا اب میرا چراغ
میرا دمساز ہی آخر مرا قاتل ٹھہرا

میں بھی تو لیلیٰ صد ناز کا جلوہ دیکھوں
ساربانؑ ایک گھڑی کے لئے محمل ٹھہرا

عمرِ رم خوردہ کی تفسیر رقم کی پرتو
جتنی مدّت میں تڑپتا ہوا یہ دل ٹھہرا[1]

---

1 یہ اشعار دل کا دورہ پڑنے پر انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کہے گئے۔

○

اگر گلہ ہے تو بس ایک ہی مقدّر سے
شِکم نے مجھ کو بہت دور کر دیا سَر سے

بلندیوں پہ فضاؤں کی یہ خیال رہا
کوئی چراغ نہ بجھ جائے میرے شہپر سے

وہ چاہتا ہے کہ کہلائے وہ بھی فیّاضی
ہمیں جو وعدۂ شبنم ملا سمندر سے

اگرچہ عینِ حقیقت ہے پھر بھی دنیا نے
تمام خواب تراشے ہیں تیرے پیکر سے

قناتِ دل بھی گری ہے تو کیسے موسم میں
نہ آہ سینے سے ابھرے نہ آنکھ ہی برسے

مجھے خود اپنی بھی صورت نظر نہیں آتی
وہ آئنہ ہوں جو ٹوٹا ہوا ہو اندر سے

مجھی کو دینِ بزرگان پہ اعتراض نہیں
یہ وہ چلن ہے کہ جاری ہے ابنِ آذر سے

کوئی تو فکر کرے کیا سبب ہے ظلمت ہی
طلوع ہوتی ہے صدیوں سے بطنِ خاور سے

وہ ایک گھونٹ جو باقی تھا رات کا پرتو
سحر کے وقت چھلکنے لگا ہے ساغر سے

○

ہر گھڑی بدلتا ہے رنگ آسماں اپنا
کس کو آشنا کہیے کس کو میزباں اپنا

اُس فلک نشیں سے ہو رابطہ کہاں اپنا
عرش پر دکاں اُس کی فرش پر مکاں اپنا

منزلوں سے تو اکثر کارواں بھٹکتے ہیں
ہم سے گم ہوا لیکن دوست کارواں اپنا

ڈولتی رہی کشتی سینۂ مقدّر پر
آج تک نہ کھُل پایا ہم سے بادباں اپنا

رَت جگوں میں ہی گزری زندگی مکینوں کی
خواب میں رہا غافل، تھا جو پاسباں اپنا

سوچئے تو کس صورت پائدار ہو گا جب
شاخسارِ نازک پر ہے یہ آشیاں اپنا

پھر تنورِ امکاں سے سیلِ آب پھوٹے گا
نوح کے پسر لاکھوں، ایک خاکداں اپنا

کاروبارِ الفت میں دل وہ راس تھا جس کو
سود میں سدا لکھا، جو ہوا زیاں اپنا

دیکھتے ہیں بس بیٹھے چشمِ نم کی گُل کاری
رہ گیا ہے دامن تک صحنِ گلستاں اپنا

جانے کیا دکھائے گی فکر کی یہ نیرنگی
تھا یقیں جو کل پرتو آج ہے گماں اپنا

○

فراقِ دوست بھی کافی نہیں جنوں کے لیے
اک اور دشت مجھے چاہیے سکوں کے لئے

بغیر عدل کہیں گر نہ جائے یہ تعمیر
ستوں ضرور ہے اس کاخِ بے ستوں کے لئے

یہ میرا عجزِ بیاں اعترافِ حسن بھی ہے
"ملا نہ لفظ تری چشمِ پُرفسوں کے لئے"

وہ کس غریب کی شہ رگ پہ جا کے ٹھہرے گی
تونگری جو چلی ایک کاسہ خوں کے لئے

کسی کو مرگِ مسلسل سے عافیت مل جائے
کوئی جواز تو ہو ہستیِ زبوں کے لئے

یہ کانِ زر تو اُسی کے طفیل نکلی ہے
ترا خیال کہ تھا کاوشِ دروں کے لئے

○

ہے یہ بھی کہانی کہ حقیقت میں نہیں ہوں
موجود ہوں ہر حال میں، صورت میں نہیں ہوں

ہوں جانبِ تکمیل رواں روزِ ازل سے
معلوم یہ ہوتا ہے کہ عُجلت میں نہیں ہوں

گزرا ہوں یمِ سحر سے ملّاحیاں[1] کرتا
حیراں ہوں میں خود، ورطۂ حیرت میں نہیں ہوں

فطرت کے قوانین شکستہ مرے ہاتھوں
لگتا ہے کہ اب چنگلِ قدرت میں نہیں ہوں

جھک جاتا ہوں میں طاقت و جبروت کے آگے
ہر چند کہ اَبنائے عبادت میں نہیں ہوں

---

1 تیراکی کے فن میں ملّاحی Breast Stroke کو کہتے ہیں۔

اک گردشِ پیہم میں گرفتار ہوں ایسا
اک لمحہ کسی سابقہ حالت میں نہیں ہوں

آدم سے عبارت ہے یقیناً مری فطرت
تخلیق میں جنت کی ہوں، جنت میں نہیں ہوں

میں نقشِ گماں ہوں کسی نقّاشِ بَریں کا
باوصف کہ ہوں، پھر بھی حقیقت میں نہیں ہوں

ہوں خالقِ کُل کی طرح پرؔتو وہ حکایت
عنوان میں موجود، عبارت میں نہیں ہوں

○

یہ زمانہ ہے کہ جلتے ہیں دیے پانی میں
اور کوئی آنکھ بھی ساکت نہیں حیرانی میں

طاقِ حسرت پہ دھرے آئنہ یہ سوچتا ہوں
لَو دیا کرتی تھی نصرت مری پیشانی میں

وہ تو آباد جزیروں کی سفارت مانگے
چھوڑنا چاہے جنوں بھی مجھے ویرانی میں

''بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا''
جیسے دریا کوئی ٹھہرا ہوا طغیانی میں

یوں بھی ہوتا ہے کہ اک شخص کی دانائی کو
وقت لکھ دیتا ہے اُس قوم کی نادانی میں

تو ہی وہ ذات کہ باعث ہے سکونِ دل کا
تو ہی وہ اسم کہ پڑھتا ہوں پریشانی میں

تو وہ دریا کہ ڈبونے سے گریزاں ہر دم
ہم وہ خاشاک کہ گرداں ہیں گراں جانی میں

درس عرفان کا دیتے ہیں جنابِ پرؔتو
عمر موصوف کی اپنی کٹی نادانی میں

○

قرینِ ثابت و سیّار رہنا چاہتا ہوں
کنارِ کوچۂ دلدار رہنا چاہتا ہوں

مجھے پسند نہیں ہے جہاں کی دارائی
میں تیرے پیار میں نادار رہنا چاہتا ہوں

غِنا سے بڑھ کے مجھے تیرا احتیاج عزیز
تری طلب میں طلب گار رہنا چاہتا ہوں

نہیں ہے تلخیٔ درماں کا بھی نیاز مجھے
سرورِ درد میں سرشار رہنا چاہتا ہوں

مرے مرض کو نہیں حاجتِ مسیحائی
جنونِ عشق میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

سدا رہوں تری رحمت کا مرکز و محور
میں تیرے در پہ گنہ گار رہنا چاہتا ہوں

مجھے قبول نہیں ہے جہانِ آزادی
ہمیشہ تیرا گرفتار رہنا چاہتا ہوں

مرے حواس بھی شامل ہوں اس کے نشّے میں
میں خوابِ زیست میں بیدار رہنا چاہتا ہوں

بطیبِ خاطرِ احقر ہے یہ بیاں پرتوؔ
رہینِ جبر ہوں، مختار رہنا چاہتا ہوں

○

جبیں کو ماہ کیا آنکھ کو ستارہ کیا
تو روشنی سے ترا حسن استعارہ کیا

نگاہ اب بھی طلسماتِ نور میں گم ہے
جہانِ حسن کا اس رنگ میں نظارہ کیا

جگر کے خوں سے سنواری ہے میں نے مانگ تری
طلائے فکر کو پگھلا کے گوشوارہ کیا

نکالی فال تو رُوئے نِکو کے مصحف سے
رُخِ جمیل کی آیت سے استخارہ کیا

مری نظر بھی بلندی کی سمت اٹھتی تھی
نجوم و ماہ نے بھی کچھ مجھے اشارہ کیا

اگرچہ تیرا تغافل بھی دل شکن تھا بہت
مری انا نے مجھے اور پارہ پارہ کیا

کہاں تھی خاک میں ورنہ یہ تاب و تب پرتو
خیالِ یارِ کو شعلہ کیا شرارہ کیا

○

نمو کا ہم تو یہ معیار کرنا چاہتے ہیں
ہر ایک پھول کو گلزار کرنا چاہتے ہیں

وہ بات جس سے ہے خوں رنگ داستاں اپنی
وہ بات ہم بھی سرِ دار کرنا چاہتے ہیں

میں ناتواں ہوں کہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں
بہت قوی ہیں جو مسمار کرنا چاہتے ہیں

ہماری مانگ کہ انصاف چاہیے ہم کو
وہ اپنے ظلم پہ اصرار کرنا چاہتے ہیں

تمہارے قرب میں وہ لوگ ہیں کہ اب ہم تو
تمہارے پیار سے انکار کرنا چاہتے ہیں

میں التفاتِ خصوصی سے ڈر رہا ہوں کہ پھر
مرے رفیق نیا وار کرنا چاہتے ہیں

اٹھا لئے ہیں دعاؤں کے واسطے تو کیا
ہم اپنے ہاتھ بھی بیکار کرنا چاہتے ہیں

خرید کر مرا آنگن زمیں کے سوداگر
مجھے ہمیشہ کو نادار کرنا چاہتے ہیں

پکارتی ہے مشیروں کی فوج یک آواز
''وہی درست جو سرکار کرنا چاہتے ہیں''

ہماری آنکھوں میں فردا کے خواب ہیں اور ہم
ضمیرِ وقت کو بیدار کرنا چاہتے ہیں

نگارخانۂ چیں ہے اگرچہ اپنا خیال
ہر ایک نقش کو شہکار کرنا چاہتے ہیں

خدائے وقت ہیں پرتو بفیضِ حُبِّ جمال
کہ ہر حسین سے ہم پیار کرنا چاہتے ہیں

○

منڈی کے لین دین میں اُلفت کہاں سے لائیں
بازارِ سیم و زر میں محبت کہاں سے لائیں

پائے طلب نے شہر میں لا کر بسا دیا
سوٗ وارثانِ قیس وہ عزّت کہاں سے لائیں

زندہ دلانِ شہر نے جیتا ہے انتخاب
لیکن سوال یہ ہے قیادت کہاں سے لائیں

اب تاجرانِ کوئے ملامت ہیں فکر میں
دولت تو آ گئی ہے شرافت کہاں سے لائیں

زَہرہ ہو آب جس سے شہنشاہِ وقت کا
یہ مفتیانِ دیں وہ حرارت کہاں سے لائیں

رشتوں کو ہم نے بیچ کے پیسے بنا لئے
بازارِ زندگی میں مرّوت کہاں سے لائیں

ہر ایک کی بغل میں صحیفہ ہے جھوٹ کا
پیغمبرانِ کِذب صداقت کہاں سے لائیں

جابر کے سامنے بھی نہ ہو حق سے منحرف
یہ قاضیانِ وقت وہ جرأت کہاں سے لائیں

چہروں پہ ان کے ساری تب و تاب زر کی ہے
یہ زاد گانِ مال ہیں غیرت کہاں سے لائیں

صدیوں کی کاوشوں سے ابھرتے ہی خدّ وخال
اس مدّتِ قلیل میں صورت کہاں سے لائیں

دستار کے طفیل ہوئے ہیں یہ سرفراز
کوتہ قدانِ جہل ہیں قامت کہاں سے لائیں

○

فشارِ درد لہو کا بہاؤ دیکھنا تھا
مرے طبیب تجھے دل کا گھاؤ دیکھنا تھا

ابھارتے ہوئے اے مانیء قضا یہ نقوش
ہمارے خوں میں بھی غم کا لبھاؤ دیکھنا تھا

مسافرت کی یہ حیرانیاں پکارتی ہیں
کہاں پہ راہ میں ہوگا پڑاؤ دیکھنا تھا

لگا کے آگ سرِ راہ تاپنے والو
سلگ نہ جائیں دلوں میں الاؤ دیکھنا تھا

مری طلب ہی نہیں دوست موردِ الزام
تجھے بھی اپنی نظر کا لگاؤ دیکھنا تھا

کہاں پہ نقدِ زرِ جاں گنوائی ہے پرتو
دکانِ عشق میں بھی پہلے بھاؤ دیکھنا تھا

وہ سروقامت وہ سرکشیدہ

وہ سروقامت وہ سرکشیدہ

چلے تو کونین ہو جلو میں

رُکے تو فصلِ بہار بن کر

سخن کرے تو کھلیں شگوفے

کہ جن سے امکاں کی مست خوشبو، حریمِ جاں کو بھی مست کر دے

نگہ اٹھائے تو جھومے دنیا

نظر ملائے تو سازِ ہستی، بغیر مضراب گنگنائے

وہ سروقامت وہ سرکشیدہ

بساطِ ہستی پہ ایک گلزارِ نو دمیدہ

ملی تو اس طرح جھٹپٹے میں کہ اگلی منزل کا کوئی نام و نشاں نہیں ہے

خرد کا فانوس جگمگائے نہ راہ دکھلائے نورِ دیدہ

میں بیتی صدیوں کی ایک ویراں سرا میں بیٹھا ہوں آبدیدہ

جنوں کی نیرنگیٔ ادا کا ستم رسیدہ

امیدِ موہوم کا گزیدہ

رسومِ الفت کی بے حسی کا جگر دریدہ

شکستہ، اندوہگیں، کبیدہ

پکارتا ہوں صمیمِ دل سے رِواقِ گیتی میں سر خزیدہ

نہ جاگ، اے شوقِ آرمیدہ، نہ جاگ اے شوقِ آرمیدہ

دادِ تخلیق

یہ دس بارہ اشخاص پر مشتمل ایک چھوٹی سی محفل تھی جس میں
بمعہ میزباں پانچ شاعر تھے شاید
جو باقی تھے وہ بھی بڑے صاحبِ ذوق ادب دوست اور نکتہ داں تھے
چنانچہ ہراک نے بڑے جذب سے اپنے اشعار پڑھ کر سُنائے
ہراک کو بڑی داد و تحسیں ملی
یہاں تک کہ پردے کے پیچھے سے بھی سارے تخلیق پارے نوازے گئے
ذرا بعد میں جبکہ ہم چائے کی میز کے گرد اپنی باتوں میں مشغول تھے
میں نے دیکھا کہ پردے کے پیچھے
کوئی خانمِ میزباں اپنے نوزاد کو پالنے میں جُھلاتی ہوئی
گویا ہم سے مخاطب ہے اور کہہ رہی ہے
ادب دوستو' شاعرو' نکتہ دانو' مجھے بھی ذرا میری تخلیق کی داد دو

کبھی لگتا ہے میں اِک جھیل ہوں

کبھی لگتا ہے میں اک جھیل ہوں اُونچے پہاڑوں پر
کہ جس سے ہو کے بستی کو کوئی رستہ نہیں جاتا
ہوائیں بھی چلیں تب بھی کہیں لہریں نہیں اُٹھتیں
کہ اندر رینگتی بیلیں ہمیشہ روکے رکھتی ہیں
بہت بارش ہو جل تھَل بھی بھریں سیلاب بھی آئیں
کسی صُورت مرا پانی کناروں سے کبھی باہر نہیں جاتا
چٹانوں کی فلک آسا فصیلیں پکڑے رکھتی ہیں
کوئی اُلفت زدہ جوڑا مرے پہلو نہیں بیٹھا
کسی بچّے نے یونہی راستہ چلتے کبھی پتّھر نہیں پھینکا
کہ مجھ کو اپنے ہونے کا کسی صُورت گماں ہوتا
کہیں پر دور میرے جسم کے گمنام حصّے میں
کوئی خواہش ہے جو پھر بھی مجھے بے خواب رکھتی ہے
سحر سے رات تک اور رات سے پھر تا سحر یوں ہی

تکا کرتا ہوں چہرہ ناشناسا نیلے گنبد کا
کہ شاید پھر فلک سے قرمزی رنگوں کی بارش ہو
بدلتے موسموں کی پھوار میں کونجوں کی ڈاریں
پیش منظر کی سراپا بے حسی میں زندگی بھر دیں
کہ شاید رات کے پچھلے پہر دلدوز سناٹے
کا پہلو چیرتے' انجان ملکوں کے پرندے' ہجرتوں
کے گیت گاتے' اجنبی دیسوں کی چاہت میں
فقط شب بھر پڑاؤ کو مرے سینے پر آ اُتریں
کبھی لگتا ہے میں اک جھیل ہوں اُونچے پہاڑوں پر.......

کارزار

نحیف چڑیا نزار چڑیا
حسین چڑیا جمیل چڑیا
کسی شکاری کا گھاؤ کھا کر نجانے کب سے سڑک کنارے پڑی ہوئی تھی
پھڑک رہی تھی
تڑپ رہی تھی
مری نہیں تھی
زمیں سے اُس کو اٹھا کے میں نے قریب ہی اِک درخت کی شاخ پر بٹھایا
کہیں سے چلّو میں پانی لا کر اُسے پلایا
وہ سانس دینے کا اک طریقہ کبھی جو بچپن میں مَیں نے سیکھا تھا آزمایا
تو چند لمحوں میں اُس نحیف و نزار چڑیا نے سر اُٹھایا
ابھی میں اپنی حقیر ہستی کی ننھی نیکی پہ آفریں بھی نہ کہہ سکا تھا
کہ مَیں نے چڑیا کو جَست بھرتے ہوا میں دیکھا
ہوا سے چڑیا جو واپس آئی

تو اُس کی ننّھی سی چونچ میں اِک حسین تتلی دبی ہوئی تھی
حسین تتلی جمیل تتلی
نحیف تتلی نزار تتلی
پھڑک رہی تھی
تڑپ رہی تھی
مری نہیں نہیں

جگ روگ

کوئی کپڑے پہ بوٹے کاڑھے کوئی پھول بنائے
کوئی اپنا بالک پالے کوئی گھر کو سجائے

کوئی بس آواز کے بل پر بجھتے دیپ جلائے
کوئی رنگوں سے کاغذ اندر جیون جوت جگائے

کوئی پتھر اینٹیں جوڑے محل دو محلے بنائے
کوئی منبر اوپر ٹُو کے پاپ اگنی سے ڈرائے

کوئی گھنگھرو باندھ کے ناچے انگ کلا دکھلائے
کوئی دھرتی کیاری سینچے پھل پھلواری اُگائے

کوئی مٹی گوندھے اس کو مانس سماں بنائے
کوئی بیٹھا آنکھیں میچے گونگے شبد بُلائے

ایک ہی سب کو روگ ہے پرتو ہر من کو برمائے
کیسے کوئی دوجے کو نت اپنا آپ دکھائے

ایک رنگ دو تصویریں

یہ اک امریکی بچّے نے کہ جس کے گھر کی چھت پر قرمزی ٹائل چمکتے تھے
کہ جس کے لان میں پھولوں کی رنگینی شفق کو ماند کرتی تھی
کہ جس کی ماں کا گہرا سُرخ سایہ[1] اپنے آسودہ تناظر کا نہایت اہم عنصر تھا
بہت ہی بے جھجک انداز میں پوچھا
ممی بتلائیں رنگِ سُرخ کیا ہے، کیسا ہوتا ہے
ممی بولیں، سنی[2] یہ رنگ ہے کھِلتے گلابوں کا
جوانی سے دمکتے عارضوں کا، رس بھرے سیبوں کا خواہش کی شرابوں کا
گلاب آسا لبوں کا حسن کا، نغموں کا، سازوں کا، ربابوں کا
غرض یہ رنگ ہے ہستی کے سب رنگین بابوں کا
ہزاروں میل اس سے دور پاکستان کی ایک خیمہ بستی میں
کہ جس میں موسموں کی شدّتوں نے رُوحِ انساں بھی جلادی ہے

---

1 انگریزی لفظ Skirt کا ترجمہ 2 انگریزی لفظ: Sonny

کہ جس میں بے گھری نے، اپنے آنگن کی مسرّت بھی بھلادی ہے

یہی اک بچۂ افغاں نے پوچھا

سہمے سہمے ڈرتے ڈرتے اپنی مادر سے

ادے[3] بتلاؤ رنگِ سرخ کیا ہے کیسا ہوتا ہے

ادے نے بکھرے بالوں کو سمیٹا اور پھر کچھ سوچ کر بولی

زمازویا[4] یہ رنگِ سرخ تو اک استعارہ ہے

اصولِ حق پہ مرنے کا شہادت کے نصابوں کا

رواں قدروں سے ٹکرانے کا جابر کے عتابوں کا

مخالف قوّتوں کی قہرمانی کا، عقوبت کا، عذابوں کا

مرے سینے کے زخموں، کا ترے بابا کے خوابوں کا

ترے بھائی کے بہتے خوں میں غیرت کے حبابوں کا

تری بہنوں کی اُجڑی مانگ کا، روتے شبابوں کا

زمینِ آدمیّت پر ہلاکت کے خرابوں کا

---

3 پشتون بچے اپنی ماں کو ادے کہہ کر پکارتے ہیں

4 پشتو بمعنی اے میرے بیٹے

مفارقتِ بیگانہ

اُسی چہل قدمی کے دوران ہم دونوں اُس باغ کی ایک پتلی روش پر مقابل ہوئے

نہ اس نے مری سمت دیکھا

نہ میں نے ہی نظریں اُٹھائیں

خموشی سے دامن بچاتے بدن کو چرائے نگاہیں جھکائے یہ دو اجنبی راہرو

اپنے سوچے ہوئے راستے چل دیئے

مگر آج بھی جب کہ اُس باغ کی کوئی شے حسبِ سابق نہیں ہے

نہ وہ کنج ہیں اور نہ وہ راستے ہیں

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہی اجنبی جس کے پیروں پہ میری نگاہیں پڑی تھیں

ابھی تک وہیں پر کھڑا ہے

اور اُس باغ کی اُس ہی پتلی روش پر وہ لمحہ

جسے کاتبِ وقت نے صبحِ روزِ ازل سے

مری زیست کے حاشیے پر لکھا تھا

مرا منتظر ہے

○

ہزاروں بندگانِ چیدہ چیدہ
پھرا کرتے ہیں پیراہن دریدہ

جنہیں میداں میں جنگیں جیتنی تھیں
وہ گوشِ فیل میں ہیں آرمیدہ

قفس میں تو بڑی مجبوریاں تھیں
چمن میں کیوں رہے ہم پر بُریدہ

کمانیں ہیں ہماری ساری سیدھی
ہمارے تیر سارے سرخمیدہ

جنہوں نے فکر کو اندھا کیا ہے
وہی سب ہیں ہمارے نورِ دیدہ

ہماری بستیاں ہیں مرگ انجام
ہمارے شہر ہیں آفت رسیدہ

ہر اک لمحہ یہاں خنجر بکف ہے
ہر اک ساعت ہے شمشیرِ کشیدہ

اطاعت ہی سعادت ہے ہماری
کہ ہم سب ہیں غلامانِ خریدہ

کوئی پوچھے تو یہ موجِ صبا سے
کہ غنچے کیوں ہیں آخر نادمیدہ

ہنر ہوتا اگر کوئی بھی مجھ میں
تو اُن کی شان میں لکھتا قصیدہ

مجھے لے ڈوبی میری حق پرستی
نہ کام آئے کچھ اوصافِ حمیدہ

مجھے دیکھو تو میرا درد سمجھو
''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ''

وہاں پہنچا ہے اب معیارِ وحشت
کہ ہر انسان ہے آدم گزیدہ

قیامت تک رلائیں گے وہ پرتو
جو نغمے رہ گئے نا آفریدہ

○

ہواؤں پر میں چلنا چاہتا ہوں
روش اپنی بدلنا چاہتا ہوں

ہزاروں سال سے بے بال و پر ہوں
قفس سے بھی نکلنا چاہتا ہوں

نہیں جنبش بھی میرے دست و پا میں
عدو کو بھی کچلنا چاہتا ہوں

شکستہ بُت ہوں میں اک بتکدے کا
نئی صورت میں ڈھلنا چاہتا ہوں

بہاروں میں بھی بے برگ و ثمر تھا
خزاں کے بیچ پھلنا چاہتا ہوں

ہوا ہوں ایسا رسوائے زمانہ
کہ اب چہرہ بدلنا چاہتا ہوں

دیا بن کر کسی تاریک گھر میں
سرِ دیوار جَلنا چاہتا ہوں

چٹانوں میں دَبا چشمہ ہوں پرتَو
چٹانوں سے اُبلنا چاہتا ہوں

○

وہ آدمی سہی تیور خدا کے رکھتا ہے
کہ بندگی میں بھی سر کو اٹھا کے رکھتا ہے

فنا کی راہ میں سرشارِ زندگی اتنا
سمجھ رہا ہے وسائل بقا کے رکھتا ہے

دھڑک رہا ہے جو سینے میں آرزو بن کر
اُسی سے اپنے عزائم چھپا کے رکھتا ہے

یہ زعم ہے کوئی اس کو بجھا نہیں سکتا
دیے کو لا کے مقابل ہوا کے رکھتا ہے

وہ ایک قطرے سے بڑھ کر نہیں ہے دریا میں
حباب کی طرح سینہ پھُلا کے رکھتا ہے

خزاں نے وقت کی پکڑا نہ اس کا ہاتھ کبھی
وہ اپنے واسطے گلشن بنا کے رکھتا ہے

مکینِ دشتِ خرابی ہے، پَر عمارت کا
وہ ایک گوشہ ہمیشہ سجا کے رکھتا ہے

لبھا سکی نہ خرد کو خدا کی رزّاقی
کہ نانِ شب سے بھی ٹکڑا بچا کے رکھتا ہے

○

قیامت خیز منظر سامنے ہے
نظر آتا ہے محشر سامنے ہے

اِسے تاریخ شاید یاد رکھے
اکیلا ہوں میں لشکر سامنے ہے

میں دو ہاتھوں سے اپنے لڑ رہا ہوں
تفنگ و تیغ و خنجر سامنے ہے

اُدھر اک فوج اعدا ہے صف آرا
اِدھر بڑھتا سمندر سامنے ہے

وہی سودائے سر بھی سرکشی بھی
وہی دیوارِ بے در سامنے ہے

مقابل میرا پندار آ گیا ہے
نظر آتا نہیں، سر سامنے ہے

سفر ہی گویا اب منزل ہے پرتو
مسافت میں ہوں اور گھر سامنے ہے

○

قصّہ انتقامِ اعدا لکھ
داستانِ تپاکِ دنیا لکھ

ذمّہ داری سے اپنی جی نہ چرا
یہ قلم کا ہے تجھ پہ قرضہ لکھ

اے قلم تجھ کو حرف کی سوگند
جو بھی کاغذ پہ لکھ وہ سچّا لکھ

آج کے آئنے کے اندر دیکھ
ممکناتِ سوادِ فردا لکھ

تجھ کو کیا کہہ رہے ہیں لوگ بھلا
تیرا کیا ہو رہا ہے چرچا لکھ

شمعِ امید کو خموش بتا
خیمۂ آرزو سلگتا لکھ

گھر کے اندر بھڑکتی آگ دکھا
بیچ آنگن الاؤ جلتا لکھ

آدمی پر قیود کے باعث
سانس کو بھی گلے کا پھندا لکھ

وقت کی انتہائے جبر دکھا
بستیوں پر فشارِ دریا لکھ

دل کی بستی کو لے گیا دریا
پیار کے شہر کو خرابہ لکھ

ایک انجانا خوف ہے دل میں
محفلوں میں ہیں لوگ تنہا لکھ

امن سوگند کو نہیں ملتا
عافیت کو وجودِ عنقا لکھ

جن کو لکھّا نظر نہیں آتا
ایسے سب رہبروں کو اندھا لکھ

زندگی ہے بذاتِ خود اظہار
جس گھڑی تک رہے تو زندہ لکھ

○

سر کی چوٹوں کو اس کا بوسہ لکھ
دردِ دل کو نشاطِ صہبا لکھ

درسِ اوّل میں لوحِ خاطر پر
بھول کر قیس، نامِ لیلیٰ لکھ

وارداتِ جنوں کا نقشہ کھینچ
ماجرائے وقوفِ صحرا لکھ

موت ہے گر رضائے بخشندہ
زندگی کو عطائے مولا لکھ

مصرعِ تر کو اک صدف گردان
میری طبعِ رواں کو دریا لکھ

خونِ دل میں ڈبو کے اپنا قلم
اُس گلِ سرخ کا سراپا لکھ

کہہ سکے تو جفا کہانی کہہ
لکھ سکے تو وفا کا قصّہ لکھ

شوقِ منزل کو اک سراب بتا
رنگِ محمل کو اک ہیولا لکھ

موت آ جائے گی کِھلا جس دن
اِس دلِ بستہ لب کو غنچہ لکھ

حسن کو دائروں کی قوسِ قزح
عشق کو میرے سر کا طرّہ لکھ

○

ہمیں اپنا سا کوئی دوسرا اچھا نہیں لگتا
مقابل ہو ہمارے آئنہ اچھا نہیں لگتا

کسی ناآشنا زینے پہ یا تاریک ڈیوڑھی میں
کبھی مل جائے کوئی آشنا اچھا نہیں لگتا

ہمیں معلوم ہیں اپنے نقائص' اپنی تقصیریں
مگر غیروں کا ہم کو ٹوکنا اچھا نہیں لگتا

مجھے جرمِ ضعیفی کی سزا دے اور اتنی دے
خدا بن جائے میرا ناخدا اچھا نہیں لگتا

جہاں بے سمت گردش ہی بجائے عینِ منزل ہو
بہت روشن سہی وہ راستہ اچھا نہیں لگتا

مٹا دے قوّتِ بازو کی جو سادہ لکیروں کو
کفِ نازک پہ وہ رنگِ حنا اچھا نہیں لگتا

کبھی ایسا بھی پرتو وقت آتا ہے محبت میں
کہ اپنا دوست اپنا آشنا اچھا نہیں لگتا

○

موت بھی گامزن تھی جان کے ساتھ
دام لپٹا رہا اڑان کے ساتھ

رہ رہے ہیں زمین پر لیکن
دوستی کی ہے آسمان کے ساتھ

لامکاں کی وہ کیا خبر دیتے
خود جو چمٹے رہے مکان کے ساتھ

بین کرتی ہے منزلوں کی ہوا
لگ کے سینے سے بادبان کے ساتھ

گر پڑوں گا میں راہ میں جس دم
درد بھی جائے گا تکان کے ساتھ

شمع کی طرح روشنی کر دیں
سر بھی کٹ جائے گو زبان کے ساتھ

میں گرا ٹوٹ کر یقیں کی طرح
اور اڑا تھا تو کس گمان کے ساتھ

اب تو اپنا نشاں نہیں ملتا
تیر خم ہو گئے کمان کے ساتھ

جسم شیشے کا لائے تھے پرتو
اور ٹکرا گئے چٹان کے ساتھ

○

ایک طوفاں کہ افق پر نہیں رہنے دیتا
رنگ پرور کوئی منظر نہیں رہنے دیتا

دستِ بے رحم جو پل بھر میں مٹا دیتا ہے
کوئی صورت کوئی پیکر نہیں رہنے دیتا

ہر گھڑی کھینچے ہے ویرانوں کی جانب مجھ کو
پائے وحشت مجھے گھر پر نہیں رہنے دیتا

طفلِ ناداں کہ اسے ضد ہے تو آئینوں سے
اپنے دامن کوئی پتّھر نہیں رہنے دیتا

ایسا سفّاک زمانہ ہے کہ ہنسنے کے لیے
کوئی دستار بھی سر پر نہیں رہنے دیتا

یوں تو رہتا ہوں سدا فکر کے بت خانوں میں
ذوقِ سجدہ مجھے کافر نہیں رہنے دیتا

نشہ کہتا ہے کہ مل جائے تو دریا پی لوں
ایک قطرہ تہِ ساغر نہیں رہنے دیتا

وقت وہ ظالمِ شب گرد ہے پرتو جو سدا
ماہتابوں کو منوّر نہیں رہنے دیتا

○

میرے مستقبل پہ کس کا نحس سایہ پڑ گیا
اک پہر گزرا نہ تھا خورشید پیلا پڑ گیا

خوف کا خاموش سناٹا ہے طاری ذہن پر
ایسا لگتا ہے کہ گھر میں آج ڈاکہ پڑ گیا

موت کی آندھی تھی یا کوئی وبائے بے اماں
دن دہاڑے جاگتی بستی میں سوتا پڑ گیا

دامنِ مہتاب تک پہنچیں نہ موجیں شوق کی
وائے زہرِ آرزو قلزم بھی نیلا پڑ گیا

صبح کے سورج میں تو سایہ بھی روشن تھا مگر
شام کیا ہونے لگی ہر رنگ پھیکا پڑ گیا

چھاؤں سے رسنے لگا ہے ایک خواب آ گیں سکوت
رُت نے کروٹ بدلی تو سایہ بھی گہرا پڑ گیا

زندگی حکمت نہیں پرتو یہ ہے پانسے کا ہاتھ
کوئی الٹا پڑ گیا اور کوئی سیدھا پڑ گیا

○

مضطرب ہو کے جو میں جانبِ سر دیکھتا ہوں
سر سے لٹکی ہوئی شمشیرِ خطر دیکھتا ہوں

سوچتا ہوں کوئی عفریت نہ اندر آ جائے
دیکھتا ہوں تو فقط جانبِ در دیکھتا ہوں

اب تو منزل کی خلش نے بھی رفاقت چھوڑی
رائگاں ہو گیا صدیوں کا سفر دیکھتا ہوں

ریگ زاروں میں کہیں کھو گئی جنت میری
اپنے آدرش کو میں خاک بسر دیکھتا ہوں

اپنے فردا سے بھی انساں کا یقیں اٹھ جائے
آج دنیا میں وہ تحقیر بشر دیکھتا ہوں

ایسا بھولا ہوں خدوخال جنوں میں پرتو
اپنے چہرے کو بھی اب بارِ گرد دیکھتا ہوں

○

بہت گو صورتِ اشعار نکلی
نہ پھر بھی کاوشِ اظہار نکلی

تجھے معلوم کیا زنداں سے کیسے
سلاسل توڑ کر جھنکار نکلی

رہا جب کچھ نہ گھر میں بیچنے کو
شرافت برسرِ بازار نکلی

جسے سمجھے تھے ہم امیدِ جمہور
وہ خود وارفتۂ دربار نکلی

دعا دیتا ہوں اپنے راہبر کو
لبِ ساحل بھی اک منجدھار نکلی

کیا ہے حبسِ دم غنچوں نے برسوں
تو پھر جا کر کہیں مہکار نکلی

ہماری بے خودی بھی بوجھ ہی تھی
ہماری آگہی بھی بار نکلی

بہ ہر انداز پانسہ پھینک دیکھا
ہر اک کروٹ ہماری ہار نکلی

انا الحق تو کسی کا واہمہ تھا
حقیقت تو فرازِ دار نکلی

کریدا وقت نے انساں کو جب بھی
چھپی حیوانیت ہر بار نکلی

نمازیں ہی رہیں دولت ہماری
امامت قسمتِ اغیار نکلی

انا ہی میرا تیرا مسئلہ تھا
انا ہی باعثِ پیکار نکلی

نہ تھا جس میں کوئی دروازہ ممکن
انا پتّھر کی وہ دیوار نکلی

تمہاری چال سے بڑھ کر مری جاں
قیامت وقت کی رفتار نکلی

دو آنسو بھی نہیں دامن میں میرے
مری الفت بڑی نادار نکلی

گریباں بھی نہ اپنے ہاتھ آیا
یہ حسرت بھی نہ آخر کار نکلی

ہزاروں آشناؤں دوستوں میں
فقط اک آستیں غم خوار نکلی

مقابل اُس بتِ مرمر کے پرتَو
یہ ساری شاعری بیکار نکلی

○

درمیانِ دلداراں پھر بھی ہر بشر تنہا
جسم عین مجلس میں، روح سر بسر تنہا

کائنات مظہر ہے، کربِ ذات کا لیکن
کرب کے ثمر لاکھوں، کرب کا شجر تنہا

دشتِ شب میں آوارہ پھر رہا ہوں میں جیسے
وسعتِ فلک میں ہو نابلد قمر تنہا

کاروانِ رفتہ کی یادگار بس یہ ہے
اک اداس سناٹا، ایک رہگزر تنہا

نقشِ دو جہاں سے بھی مٹ نہ پائی تنہائی
اے مآلِ نقاشی، ہائے نقش گر تنہا

کارزارِ ہستی میں، ہوں میں ایک دیوانہ
بے خیال و وارفتہ، مست و بے خبر، تنہا

مل گیا سراغ اُن کو دشت میں دفینوں کا
ورنہ کیوں پھرا کرتے حضرتِ خضرؑ تنہا

اک عجیب حالت ہے وصل بھی جدائی بھی
میں ادھر اکیلا ہوں اور وہ اُدھر تنہا

انجمن میں رہ کر بھی محفلیں سجا کر بھی
ہر قدم رہا پرتو عمر کا سفر تنہا

○

عشق کا سود و زیاں حسنِ تجارت مانگے
زندگی قرض نہ دے پیشگی قیمت مانگے

جاں کو جانے کے لیے کوئی بہانہ درکار
جسم مہمائیٔ جاں کے لیے راحت مانگے

پیار کہتا ہے لپٹ جائیں تو پھر سانس نہ آئے
حسرتِ وصل سوا اس سے بھی قربت مانگے

تجھ کو دیکھوں تو کچھ اس طرح کہ جھپکے نہ پلک
خواہشِ دید مری، منزلِ حیرت مانگے

فکر چاہے کہ وہ آنگن میں رہے محوِ خرام
قلبِ ہنگامہ طلب روز قیامت مانگے

سرنگوں بیٹھا ہوں خوابوں کے کھنڈر پر ایسا
ہر نفس مجھ سے خطاؤں کی وضاحت مانگے

زور دستی ہے مشیّت کی کہ جینا ہو گا
زیرِ دستی ہے کہ مرنے کی اجازت مانگے

زندگی زہر پلاتی رہی ہر دم پرؔتو
آرزو پھر بھی اُسی لب کی حلاوت مانگے

○

یہ نظامِ وقت سارا آج اُلٹا ہو گیا
شام سے پہلے ہی دنیا میں اندھیرا ہو گیا

چھٹ گئی دستِ مشیّت ہی سے شاید اُس کی باگ
راہوارِ وقت ہی یا آج اندھا ہو گیا

ایسا لگتا ہے کہ میری ماں دوبارہ مر گئی
ایسا لگتا ہے کہ اک محشر دوبارہ ہو گیا

جھوٹ کی نگری میں سچ کا اس قدر ہی دخل ہے
دل کو اک دھڑکا لگا تھا آج سچّا ہو گیا

ہم کو بھی دیکھیں ادھورے رہ گئے تیرے بغیر
وہ جو کہتے ہیں کہ تیرا وقت پورا ہو گیا

تیرے اپنوں نے ترے چہرے پہ ڈالی بڑھ کے خاک
تیرا دشمن کیوں ترا اپنا سراپا ہو گیا

ہم تو گونگے تھے ازل کے، مانگتے کیسے دُعا
تو بھلا کیوں قاضی الحاجات بہرا ہو گیا

موت ہی شاید بھرے گی اب ہمارے دل کے گھاؤ
تیرا زخمِ زندگی تو خیر اچھا ہو گیا

پیار کا دریا تھا اک بہتا تھا سارے شہر میں
اور اب گز بھر زمیں میں جذب دریا ہو گیا

دفن کر کے اپنے ہاتھوں سے تجھے زیرِ زمیں
اِس زمیں سے میرا رشتہ اور گہرا ہو گیا

دیکھئے کب ٹوٹتا ہے اور ملتی ہے نجات
اب تو یہ تارِ نفس گردن کا پھندا ہو گیا

چھائی ہے کچھ اس طرح پرتوِ تھکن اعصاب پر[1]
آج یہ محسوس کرتا ہوں کہ بوڑھا ہو گیا

---

1 یہ اشعار اپنی ایک عزیزہ کی موت پر کہے گئے۔

○

افسوس کرتا میں یونہی ہر شام رہ گیا
جس کام کو چلا تھا وہی کام رہ گیا

آنگن میں بین کرتے رہے شب کے نوحہ گر
خورشید مسکراتا سرِ بام رہ گیا

اب صبحِ بزم مے ہے یہ حسرت کہ دوستو
اک قطرۂ شراب تہِ جام رہ گیا

خود معرضِ فنا میں ہو جب صاحبِ نشاں
کس بات کی خوشی کہ مرا نام رہ گیا

پرتو بیاضِ شوق پہ ابھرا نہ کوئی نقش
ہر رنگ آرزو کا مری خام رہ گیا

○

فَرطِ وحشت میں غبارِ صحنِ صحرا یاد ہے
رقص کرتا اس میں حیرت کا بگولا یاد ہے

آسماں آسا پہاڑوں کی تھی اک چوٹی جہاں
قافلہ خانہ بدوشوں کا گزرتا یاد ہے

ایک بجلی تھی جو کوندی تھی نظر کے سامنے
مجھ کو اپنی خود فراموشی میں اتنا یاد ہے

قدِّ آدم اک قیامت گام زن تھی چاق[1] چاق
حشر خیزاں، زلف جنباں، اک سراپا یاد ہے

نام کیا تھا اُس پری صورت کا یہ پوچھا نہیں
لوحِ دل پر نقش ہے اب تک جو چہرہ یاد ہے

---

1 منظر کی حقیقی عکاسی کے لئے یہ پشتو طرز اظہار اپنایا گیا ورنہ تیز تیز بھی ہو سکتا تھا

پھر نہ جانے کارواں کس سمت گُم ہوتا گیا
دور ہوتے گہرے سایوں کا ہیولا یاد ہے

میں وہ مجنوں ہوں دیارِ عشق کا پرؔتو جسے
ماجرائے عشق میں بس حسنِ لیلیٰ یاد ہے

○

میرے پہلو میں جو پرتو مرا سانول ہوتا
میرے لب پر کوئی ڈھولا کوئی منگل ہوتا

سانس تو لیتے سکوں سے یہ ترے دیوانے
خشت و آہن کی جگہ کاش کہ جنگل ہوتا

عقل طعنے تو نہ دیتی مجھے ناکامی کے
تیری اُلفت میں اگر دوست میں پاگل ہوتا

تیرے کاندھے سے ڈھلکتا نہیں لمحہ بھر کو
اے گل اندام اگر میں ترا آنچل ہوتا

دستِ فطرت کو سکھاتا میں اصولِ بخشش
خشک کھیتوں پہ برستا ہوا بادل ہوتا

اس کے چہرے سے کیا کرتا دل و جاں روشن
اس کی محفل میں اگر میں کوئی مشعل ہوتا

کہنیاں مارتا چلتا جو میں ہم گاموں کو
دوڑ میں جیتنے والوں میں بھی اوّل ہوتا

○

اس گرمیٔ بازار سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی
سچ جانیے دوکان کے اندر نہیں کچھ بھی

ہم جہدِ مسلسل سے جہاں ٹوٹ کے گر جائیں
وہ لمحہ حقیقت ہے، مقدّر نہیں کچھ بھی

مجبور، تجسّس نے کیا ہے ہمیں ورنہ
اس قید کی دیوار کے باہر نہیں کچھ بھی

افکار کے اجسام بناتے ہیں، ہمیں تو
افکار کے اصنام سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی

یہ میری تمنّا ہے کہ جنبش میں ہیں پردے
اک خواہشِ پیہم ہے پسِ در نہیں کچھ بھی

وہ رنگِ تماشا کہ اُفق پر ہے پریشاں
اعجاز بصارت کا ہے منظر نہیں کچھ بھی

افکار کی اقلیم وراثت ہے ہماری
اور اس کے سوا ہم کو میسّر نہیں کچھ بھی

درویش بھی ہوتے ہوئے ہم ایسے غنی ہیں
دارائی دنیائے سکندر نہیں کچھ بھی

جس تختِ غنا پر متمکن ہوں میں پرتوؔ
اُس دولتِ بے حد کے برابر نہیں کچھ بھی

کفشِ خاک آلود

مرے ذہن میں خانوادوں کی بکھری ملاقات کے چند لمحوں کی یادیں
کئی سال تک فون پر کی گئی الٹی سیدھی سی باتوں کا بے معنی احساس
مری سوچ کے چند بے تک ہیولے
کلاسیکی کردار۔ مجنون و فرہاد
محبت کی اسٹیج پر اُن کی پُر مغز گفتار کی خواب آلودہ گونجیں
مگر دل دھڑکتا تھا' میرا گلا خشک تھا اور زباں پارۂ چوب تھی
کہ اتنے میں وہ ناخنوں کو بناتی ملازم کو احکام دیتی مرے پاس ہی ایک اسٹول
پر آ کے بیٹھی

نہ پوچھو کہ یہ لمحہ کس طرح بیتا
نہ اوسان بس میں' نہ احساس باقی
بدن برف ِسل کی طرح مُنجمد تھا
ذرا ہوش آیا تو وہ کہہ رہی تھی
''وہ ہمسر تمہاری جو ہر درد میں وجہِ درماں بنی ہے

وہ ساتھی کہ جس نے تمہاری رفاقت پہ دُنیا تجی ہے

مری دوست ہے

میں نہیں چاہتی دوستی کا یہ دیرینہ رشتہ شر آشنا ہو

ہمارے اس اُجلے تعلق کو جذبات کی اندھی گھاٹی میں کیوں پھینکتے ہو وغیرہ وغیرہ''

میں جب سیڑھیوں سے اُتر کر سرِ راہ آیا

تو چہرہ تو اپنا نہیں دیکھ پایا

مگر اتنا البتہ دیکھا کہ جوتوں پہ مٹّی جمی تھی

انہدامِ فصیلِ سنگِ مرمر

لڑکپن سے میں اس کو دیکھا کیا

وُہ قلوپطرہ کے حجلۂ خواب کی سنگِ مرمر کی بے حس فصیلِ منقّش تھی جس پر

گلابوں کی بیلیں چڑھی تھیں

یہ مرمر کی بے حس فصیلِ منقّش

کہ جو موسموں اور جذبوں کے سارے شدائد سے مُنکر

سرافراشتہ، سرکشیدہ

پچھلے پچیس سالوں سے یونہی مرے راستے میں کھڑی تھی

نہ معلوم آج ابتدائے زمستاں کی اس عام سی شام میں

جب کہ خورشید روشن ہے ماحول بھی گرم ہے

کیسے گمنام طوفان سے منہدم ہو کے آغوش میں آ گری ہے

میں حیراں مذبذب کہ اس سنگ مرمر کی بے حس فصیلِ منقّش میں بھی

ایک بیدار حساس عورت چھپی ہے

سگِ بخواب رفتہ

میرا کُتا مجھے ذائقوں کی تھکا دینے والی بڑی تنگ و تاریک گلیاں گھماتا رہا
میں خاموش چاکر کی صورت قدم پر قدم رکھتا پیچھے رواں تھا
کبھی میں نے پوچھا نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں
بھلا اس سفر کی کوئی انتہا ہے
مگر اَب کہ سورج بھی ڈھلنے لگا ہے
اندھیرے بھی بڑھنے لگے ہیں
میرا کُتا بھی تھک کر مرے جسم کے سایے میں سو گیا ہے
مرے سامنے اک عجب مسئلہ ہے
کہ میں ذائقوں کی تھکا دینے والی سیہ تنگ و تاریک گلیوں میں
ماضی کے خوش ذائقہ حافظے کے سہاروں پہ پھر بھی رواں ہوں

دو خوف

اور اُس دن کی جب رات آئی تو اُس نے کہا
مرے اتنے نزدیک مت آؤ اے اجنبی
مجھے خوف سا آ رہا ہے
اور اُس رات کی جب سحر آئی
تو وہ مرے یخ زدہ جسم سے شعلہ آسا لپٹ کر یہ بولی
مرے پیارے تم مجھ سے کیوں اس قدر دور ہو
میرے نزدیک آؤ
مجھے خوف سا آ رہا ہے

پن کشن

مرے پن کشن میں بہت سی پنیں ہیں
اور اکثر پنیں اس میں ایسی ہیں جو
دُور انجانے ملکوں سے آئے خطوں سے نکالی گئی ہیں
مگر اس گھڑی ایک ظاہر حقیقت کی صورت مرے پن کشن میں لگی ہیں
اگر پن کشن کی ہر اک پن یہ سوچے
کہ میں تو فلاں دیس کی ہوں
فلاں دیس نے میرا لوہا بنایا
فلاں دیس نے میری صورت گھڑی تھی
تو یہ سوچنا پن کشن کی حقیقت کو خطرے میں ڈالے نہ ڈالے
پنوں کو یقیناً جڑوں سے ہلا دے گا
اور پھر یہ ساری پنیں
بے سکت
بے جہت
بے ہدف
یونہی رُلتی پھریں گی

تفاوتِ راہ

حسین کافوری انگلیوں میں سفید سگریٹ لئے وہ لڑکی
گھڑی گھڑی اپنے سُرخ نرم ہونٹوں سے یوں لگاتی
کہ جیسے جیون کے سوم رس کو وہ گھونٹ بھر بھر کے پی رہی ہو
مگر طلب کا وصالِ لب کا
وہ ایک لمحہ گریز پا تھا
سیاہ ایڑی زمین پر اُس کو بے حسی سے کچل رہی تھی

○

حدودِ موسم گل میں کہاں دکھائی دیا
بہارِ حسن کا جو کل سماں دکھائی دیا

فرازِ شوق سے بھی جو نظر نہیں آیا
نشیبِ عمر پہ وہ آسماں دکھائی دیا

وہ سادہ رُخ کہ جسے دیکھ کر گزر جاتے
عناں کشِ نظر رہ رواں دکھائی دیا

نہاں تھا سات حجابوں میں آج تک جو عکس
برونِ آئینہ مجھ کو عیاں دکھائی دیا

طلوعِ صبح کا منظر تھا اُس گریباں پر
میں سوچتا تھا کہ سورج کہاں دکھائی دیا

یہ لمسِ لب ہی کا اعجاز تھا کہ وہ گل رو
کلی سے گُل ہوا پھر گلستاں دکھائی دیا

نظر میں کیسے سماتا جہانِ حسن اس کا
نظر جہاں بھی پڑی اک جہاں دکھائی دیا

جمالِ یار کی وہ آیتیں پڑھیں میں نے
کہ جبرئیل مجھے ہم زباں دکھائی دیا

عطائے حسن کا شب ایسا ماجرا تھا کہ بس
گدائے شوق وہاں بے زباں دکھائی دیا

طریقِ ناز تو مسلک تھا اس کا، پر وہ شخص
رموزِ عشق کا بھی نکتہ داں دکھائی دیا

عَرَق عَرَق بھی وہی ماہوش تھا جو پہلے
عروجِ کیف میں برقِ تپاں دکھائی دیا

ستارے قدموں پہ میرے نثار ہوتے تھے
فلک بھی سر پہ مرے گلفشاں دکھائی دیا

مجھے لگا کہ میں سلطانِ عصر ہوں پرتو
مری رکاب میں دورِ زماں دکھائی دیا

○

سماعت کھو گئی ہے آہٹوں میں
نظر آتا نہیں کچھ منظروں میں

پریشاں ہے مرے خوابوں کی تعبیر
ترے بستر کی ٹھنڈی سلوٹوں میں

وہ کب کا جا چکا محفل سے اُٹھ کر
مگر خوشبو بسی ہے ساعتوں میں

مری خوش فہمیاں دیکھو کہ اب تک
بھرے بیٹھا ہوں اس کو بازوؤں میں

کسی پہلو قرار آتا نہیں ہے
کہ خار اُگنے لگے ہیں کروٹوں میں

اندھیرا پھیلتا جاتا ہے ہر سو
دیا بجھنے لگا ہے آندھیوں میں

ترے لمسِ بدن سے کیا عجب تھا
بدل جاتیں یہ پوریں مشعلوں میں

یہ لگتا ہے کہ دنیا بھر کی تلخی
سمودی ہے کسی نے ذائقوں میں

میں کھو بیٹھا ہوں خدّوخال اپنے
تجھے ہی دیکھتا ہوں آئنوں میں

فضاؤں سے برستی ہے تمازت
لگی ہو آگ جیسے جنگلوں میں

جدائی تیری ایسے مرحلے پر
تری فرقت اور ایسی بارشوں میں

رقابت میں کوئی پھلتا ہے کیسے
میں خوں روتا ہوں پرَتو چاہتوں میں

○

تخت کہتا ہے کہ اب شمشیر و خنجر چاہیے
تاج رکھنے کے لیے سلطان کا سر چاہیے

شام کی تمثیل کب ممکن ہے سرخی کے بغیر
ڈوبتے خورشید کو رنگین منظر چاہیے

ایسی بے ہوشی کا ناممکن ہے صندل سے علاج
ہوش لانے کے لیے اب سر کو پتّھر چاہیے

یہ فسادِ خوں ہے سارے جسم میں پھیلا ہوا
اس مرض کے واسطے فصّاد و نشتر چاہیے

زندہ رہنے کے لیے تو تھا ہی اک لشکر ضرور
اب تو مرنے کے لیے بھی ایک لشکر چاہیے

ایک دو دریا نہ دھو پائیں گے یہ دامن کے داغ
سارا دامنِ پاک کرنے کو سمندر چاہیے

اس عدالت سے کہاں ممکن ہے پرتو احتساب
وقت کا اعلان کہتا ہے کہ محشر چاہیے

○

اک دو نفل یہاں بھی ادا کر کے دیکھیے
سجدے میں اُس حسیں کی ثنا کر کے دیکھیے

ایجابِ مدّعا کے لیے اُس کی دھوم ہے
اُس آستاں پہ آپ دعا کر کے دیکھیے

پھر دیکھیے کشادگیٔ عقدہ ہائے کار
ناخن سے ہر اصول جدا کر کے دیکھیے

گونجیں گی یہ فضائیں رفاقت میں آپ کی
اِس دشتِ ناکساں میں صدا کر کے دیکھیے

ساحل پہ ہی ملیں گے گہر ہائے آرزو
اُس ناخدا کو آپ خدا کر کے دیکھیے

قانونِ بندگی میں وہ تعزیر اب نہیں
جنت میں اُس کی پھر وہ خطا کر کے دیکھئے

آدرش کے لیے تو لڑے ہیں تمام عمر
ماحول سے بھی آج وفا کر کے دیکھئے

خلعت ملے گا آپ کو منصب کے ساتھ ساتھ
ہر ناروا عمل کو روا کر کے دیکھئے

دیکھیں گے پھر وجود کی نیرنگیاں حضور
اپنی انا کو آپ فنا کر کے دیکھئے

چومے گی ہاتھ آپ کے پرتوِ بروت و ریش
پیراہنِ حیات قبا کر کے دیکھئے

○

ہر لحظہ اک طلسم نیا، صورتوں کا ہے
گردِ وجود ایک حصار آئنوں کا ہے

آسان ہے اگر ہو کوئی محورِ خیال
ورنہ یہ زندگی تو سفر دائروں کا ہے

دو رنگ زندگی کے ہیں چھائے ہیں ہر بسر
اک موجۂ بلا کا ہے، اک ساحلوں کا ہے

پھندا بنے گلے کا نہ دستارِ پیچ پیچ
سر کو بچایئے کہ نگر رہزنوں کا ہے

بہتا ہے جس کے کوچہ و برزن میں میرا خوں
وہ شہرِ نا پناہ مرے بھائیوں کا ہے

دیکھا تو شاخِ خشک پہ مشکل تھا انحصار
سنتے تھے ہم کہ سارا چمن طائروں کا ہے

وہ دورِ ابتلا بھی فقط دوستوں کا تھا
یہ دورِ افتخار بھی بس دوستوں کا ہے

لگتا ہے بیچ صحن کے سڑتی ہے کوئی لاش
اور اس کے گرد شور و شغب کرگسوں کا ہے

پرؔتو بھی حزبِ شاہ میں شامل ہیں اس لیے
دربار میں سنا ہے اثر شاعروں کا ہے

○

سمجھوتہ کر لیا ہے قضا و قدر کے ساتھ
خاموش بہہ رہا ہے جو دریا بھنور کے ساتھ

ویرانیوں میں شہر کی ڈھونڈے ہے برگ و بار
وہ آرزو کہ چمٹی ہوئی ہے نظر کے ساتھ

کیا آتشِ فراق، یہ ممکن ہے مل سکے
اک لمحۂ فراغ مجھے بھی شرر کے ساتھ

اِس قتل گاہِ دہر میں حیراں ہوں کس طرح
رنگِ غرورِ فکر دوبالا ہو سر کے ساتھ

منظر کو ایک لمحہ وہ چمکا گیا مگر
نسبت خیال کو رہی دائم قمر کے ساتھ

کندہ کیا تھا جس نے جوانی میں تیرا نام
لپٹا ہوا ہے اب بھی وہ لمحہ شجر کے ساتھ

پرتو ابوالبشر نے بھی وہ کچھ نہیں کیا
جو کچھ کیا ہے ابنِ بشر نے بشر کے ساتھ

○

چلو یہ کارِ محبت بھی کر کے دیکھتے ہیں
جیے ہیں جس کے لیے اس پہ مر کے دیکھتے ہیں

پھر اس کے بعد اندھیرے ہی کیوں نہ در آئیں
وہ آفتاب سہی آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

ورائے کوچۂ جاں ہے اگر وہ منزلِ دوست
ورائے کوچۂ جاں بھی گزر کے دیکھتے ہیں

چلے کہاں سے تھے کس جا پہنچ گئے ہم لوگ
بطرزِ موجۂ دریا ابھر کے دیکھتے ہیں

فرازِ ماہ نہ پہنچے تو کیا زمین تو ہے
زقند ایک ہواؤں میں بھر کے دیکھتے ہیں

اگر نہیں ہے کنارِ خرد دُرِ مقصود
میانِ قعرِ جنوں ہی اتر کے دیکھتے ہیں

بنا ہے گوشۂ عُزلت تو جامِ جم اپنا
خموش ہیں در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

عجب نہیں وہ بتِ کم سخن بھی بول اٹھّے
حرم میں جاتے ہیں اور بات کر کے دیکھتے ہیں

وہ کون ہے کہ پسِ آئنہ بھی ہے پرتو
وہ کون ہے جسے ہم بن سنور کے دیکھتے ہیں

○

ہر گھڑی مرتا ہوں میں اِک نئی بیداد کے ساتھ
زندہ رکھا ہے مجھے اُس نے رَکن اضداد کے ساتھ

میری فطرت کو عطا کی کششِ قامت و جسم
زندگی میں نے گزاری مگر اعداد کے ساتھ

آرزوئیں کہ نہیں چھوڑتیں مسکن اپنا
ایک بستی بھی ہے گویا دلِ برباد کے ساتھ

صلح کر لیتے فرنگی سے نہ رسوا ہوتے
اِس پہ، خوابوں میں لڑا کرتا ہوں اجداد کے ساتھ

بے سبب کون دیا کرتا ہے جانِ شیریں
کوئی رشتہ تو ہے پرتو ترا فرہاد کے ساتھ

○

میری آنکھوں کو خدا اتنی تو بینائی دے
مجھ کو دیوار پہ لکھا ہوا دکھلائی دے

آئنہ خانے میں حیران کھڑا ہوں کب سے
مالکِ نطق مجھے قوّتِ گویائی دے

میں بھی انصاف کا طالب ہوں خدایا مجھ کو
حاکمِ وقت سے تھوڑی سی شناسائی دے

اب تو اللہ سے ہر دم یہ دُعا مانگتا ہوں
مجھ کو اس تنگیٔ عزلت ہی میں پہنائی دے

اے حسیں میں تو دُعا گو ہوں جو کہتا ہوں تجھے
حسن کے ساتھ خدا دولتِ دانائی دے

ہر گھڑی عقل کا سورج ترے آنگن چمکے
شیشۂ وقت میں دنیا تجھے دکھلائی دے

اپنے عشّاق کی بستی کو تو ظالم نہ اجاڑ
رب تجھے اور بھی ذوقِ چمن آرائی دے

اب تو بس ایک ہی صورت ہے ستم کی تیرے
دستِ قاتل کو خدا ذوقِ مسیحائی دے

کس کو معلوم ہے اورنگِ زمانہ پرتو
گل سحر دم کسے آوازِ پذیرائی دے

○

رواقِ چرخ میں تیری نظر کو دیکھتا ہوں
غروبِ شمس، طلوعِ قمر کو دیکھتا ہوں

سمٹ گیا ہے سروں سے سکون کا سایہ
تمازتوں میں برہنہ شجر کو دیکھتا ہوں

میں پاشکستۂ اوہام ہوں ترے در پر
اٹھائے ہاتھ دعا کے اثر کو دیکھتا ہوں

بھٹک رہا ہے اک انبوہ، ظلمتِ شب میں
فرازِ بامِ تماشا خضر کو دیکھتا ہوں

یہ پوری نصف صدی کے عمل کا حاصل ہے
میں کشتِ زارِ ہوس کے ثمر کو دیکھتا ہوں

چلے تھے جب بھی وہی اک سوال سمت کا تھا
وہی سوال ہے اب بھی جدھر کو دیکھتا ہوں

درِ امیّد بھی جس سے نہ ہو سکا روشن
میں کم سوادیٔ نورِ سحر کو دیکھتا ہوں

عجیب خوف ہے بے چین رکھتا ہے شب بھر
کبھی میں در کو کبھی قفلِ در کو دیکھتا ہوں

نجانے گرد ہوا کس افق، مہِ منزل
فضا میں صرف غبارِ سفر کو دیکھتا ہوں

خرابِ چشمِ نظارہ ہوں اس قدر پرؔتو
لگا کے آگ میں اب اپنے گھر کو دیکھتا ہوں

○

رات کا یہ سناٹا اور فضا کی خاموشی
صد جہانِ جاں سوزی اک صدا کی خاموشی

سنگدل وہ کیسا ہے دیکھ کر نہیں پگھلا
بے بسی کے چہرے پر التجا کی خاموشی

ایک خطِّ فاصل ہے درمیان دونوں کے
زاریٔ سحر میری اور خدا کی خاموشی

ریگزارِ امکاں میں یہ گھڑی قیامت ہے
دل فگار تنہائی آشنا کی خاموشی

اک عجیب منظر ہے' ہاو ہو لبِ ساحل
ڈوبتی ہوئی کشتی' ناخدا کی خاموشی

یاد کیجئے پرتو ابتدا کا ہنگامہ
دیکھ کر سرِ محفل انتہا کی خاموشی

○

بشر میں بھی درندہ دیکھتے ہیں
خداوندا یہ ہم کیا دیکھتے ہیں

زمیں پر چل رہی ہے کالی آندھی
فلک سے خوں برستا دیکھتے ہیں

یہ ہم ہی ہیں مقابل آئنے کے
یہ ہم اپنا ہی چہرہ دیکھتے ہیں

وہ میرا بھائی ہے جس کو کہ اغیار
مری تربت پہ ہنستا دیکھتے ہیں

ہمارے سامنے یہ گھر بنا تھا
ہمیں اب اس کو گِرتا دیکھتے ہیں

کھلونا ڈال کر بچّوں کے آگے
بڑے بیٹھے تماشا دیکھتے ہیں

اسی مشعل سے آنگن تھا منوّر
اسی سے گھر کو جلتا دیکھتے ہیں

کہاں جائیں گے اُڑ کر اب پرندے
شجر پر سانپ چڑھتا دیکھتے ہیں

درندے گھومتے ہیں بستیوں میں
چمن کے بیچ صحرا دیکھتے ہیں

مری بینائی مجھ سے پوچھتی ہے
بھلا اہلِ نظر کیا دیکھتے ہیں

بصارت پر میں ان لوگوں کی قرباں
جو اس لمحے "سب اچّھا" دیکھتے ہیں

حسیں قامت میں تیرے آج پرتو
قیامت کا سراپا دیکھتے ہیں

○

ندامت ہو نہ تیری دوستی میں
کوئی معیار بھی رکھ دشمنی میں

ترے حق میں ہی لکھّے گا مورّخ
جو دن گزرے گا امن و آشتی میں

قد و قامت کا بھی اپنے بھرم رکھ
نہ جھک اتنا کسی کی دوستی میں

ترے اپنے بھی بیگانے ہوئے ہیں
عجب تیور ہیں تیرے بے رُخی میں

ترے وعدۂ فراموشی کا حاصل
ترے پیمانؑ سارے بے خودی میں

خدا رحمت کرے ہر ناخدا پر
بڑے طوفان آئے زندگی میں

وہ دیوی لمس سے خائف کہ پرتو
خدائی کھو نہ بیٹھے بندگی میں

○

اے خدا اپنی رضا کو مرا رہبر کر دے
آدمیّت سے میرا قلب منوّر کر دے

برگِ گل ہی نہیں ہو جائے گلستان سیراب
شبنمِ جاں کو تو چاہے تو سمندر کر دے

قربتِ ہم سفراں سے مجھے خوف آتا ہے
اے مرے آئنہ گر مجھ کو بھی پتّھر کر دے

عین ممکن ہے زمیں ہی مری جنّت بن جائے
جسم کی خاک اگر خاک کا خوگر کر دے

ڈریے اس وقت سے جب قحطِ مکافاتِ عمل
ان زمینوں کو سدا کے لیے بنجر کر دے

مالکِ وقت سے بس ایک دعا مانگتا ہوں
میرا فردا مرے امروز سے بہتر کر دے

صدفِ وقت میں غلطاں ہوں اس امیّد کے ساتھ
یہ تلاطم کبھی پرؔتو مجھے گوہر کر دے

○

اب شوق میں شعلوں کا اثر کیوں نہیں ملتا
خاکسترِ دیشب میں شرر کیوں نہیں ملتا

نم میرے پسینے سے ہے جب دیس کی مٹی
مجھ کو مری محنت کا ثمر کیوں نہیں ملتا

میں دست بدیوار ہوں بے سمت روانہ
اس مَحبس تاریک کا در کیوں نہیں ملتا

ہر گام پہ بستی کے' خداؤں کے ہیں ڈیرے
حیراں ہوں کہ دنیا میں بَشر کیوں نہیں ملتا

صدیوں کی مسافت کا سوال ایک ہے پرتوؔ
مجھ خانماں برباد کو گھر کیوں نہیں ملتا

○

شب گزرتی کیوں نہیں سورج نکلتا کیوں نہیں
درد پتھّر بن گیا آخر پگھلتا کیوں نہیں

کیوں نہیں اٹھتی کسی وارفتۂ الفت کی چاپ
سوئے منزل کاروانِ شوق چلتا کیوں نہیں

تیرے کوچے سے بھٹکتا جا رہا ہوں ہر گھڑی
کیسا نابینا مسافر ہوں سنبھلتا کیوں نہیں

اب تو آنکھیں دکھ گئی ہیں جھٹپٹے میں شام کے
دُھند چھَٹتی کیوں نہیں منظر بدلتا کیوں نہیں

نوح کے بیٹوں کا ہے فطرت سے کیا کچھ ساز باز
برق گرتی کیوں نہیں محشر ابلتا کیوں نہیں

رات کی بے سمت گہرائی ہے پرتو اک سوال
صبح کے پیکر میں میرا خواب ڈھلتا کیوں نہیں

○

مہک پھولوں کی رنگِ گلستاں حیرت میں رکھتا ہے
مجھے ذوقِ عجیبِ باغباں حیرت میں رکھتا ہے

بناتا ہے جو قرطاسِ فلک پر طُرفہ تصویریں
وہ فنکارِ فلک ابرِ رواں حیرت میں رکھتا ہے

چلا جاتا ہوں چھوتا چھیڑتا مہتاب و انجم کو
زمیں سے مجھ کو قربِ آسماں حیرت میں رکھتا ہے

کبھی مندر کی بجتی گھنٹیاں مسحور کرتی ہیں
مساجد کا کبھی شورِ اذاں حیرت میں رکھتا ہے

مسخر کرتی ہے دل کو کبھی بچّے کی کلکاری
کبھی بوڑھوں کا اندازِ فغاں حیرت میں رکھتا ہے

کئی ناداں مجھے الزام دیتے ہیں پرستش کا
حقیقت میں مجھے حسنِ بتاں حیرت میں رکھتا ہے

نہیں کھُلتا کہ یہ جادو ہے پرتوِ حسنِ منظر کا
کہ خود میرا گدازِ قلب و جاں حیرت میں رکھتا ہے

○

میں جو صحرا میں کسی پیڑ کا سایا ہوتا
دل زدہ کوئی مرے ساتھ تو بیٹھا ہوتا

اب تو وہ شاخ بھی شاید ہی گلستاں میں ملے
کاش اس پھول کو اس وقت ہی توڑا ہوتا

وقت فرصت نہیں دے گا ہمیں مرنے کی کبھی
آگے بڑھتے ہوئے یہ بھی کبھی سوچا ہوتا

ہنستے ہنستے جو ہمیں چھوڑ گیا ہے حیراں
اب رلانے کے لیے یاد نہ آیا ہوتا

وقتِ رخصت بھی نرالی ہی رہی دھج تیری
جاتے جاتے ذرا مڑ کے بھی تو دیکھا ہوتا

کس سے پوچھیں کہ وہاں کیسی گزر ہوتی ہے
دوست اپنا کبھی احوال تو لکھا ہوتا

ایسا لگتا ہے ابھی خواب سے جاگا ہوں میں
سوچتا ہوں یہ مرا خواب نہ ٹوٹا ہوتا

زندگی پھر بھی اسی طور پہ رہتی اپنی
ہر قدم ساتھ اگر ایک مسیحا ہوتا

ایک محفل ہے کہ دن رات بپا رہتی ہے
چند لمحوں کے لیے کاش میں تنہا ہوتا

○

اندرونِ سخنِ یار نہیں دیکھتا میں
جھانک کر سینۂ دلدار نہیں دیکھتا میں

میں تو چلتا ہوں سدا صرف صلائے گُل پر
کیسی ہو گی خلشِ خار نہیں دیکھتا میں

ہاتھ میں میرے جو موجود ہو دے دیتا ہوں
ماورائے کفِ نادار نہیں دیکھتا میں

سحر کرتا ہے مرے دل پہ خلوصِ اظہار
حدِّ آوازۂ فنکار نہیں دیکھتا میں

دیکھتا یہ ہوں کہ دیوار پہ کیا لکھا ہے
لیکن اکثر پسِ دیوار نہیں دیکھتا میں

وہ بلاتا ہے تو چل دیتا ہوں بے سُدھ ہو کر
راہ آساں ہے کہ دشوار نہیں دیکھتا میں

اپنا مطلوب دکاں میں ہو تو قیمت کیسی
سردی و گرمیٔ بازار نہیں دیکھتا میں

غور سے سنتا ہوں ہر بات جو اس لائق ہو
چہرہ و طرّۂ دستار نہیں دیکھتا میں

اس کی طاعت بھی تو میرا ہی شَرف ہے پرؔتو
میں ہوں مجبور کہ مختار نہیں دیکھتا میں

منزلِ نو

یہ شمع کا متلاشی یہ نور کا جویا
دیارِ شب کی مسافت سے چور تھا، یا پھر
حیاتِ نیم شبی کا کوئی ہدف پانے
فصیلِ حسنِ جہاں سوز سے گزرتا ہُوا
سیہ کتاب کے ٹھنڈے ورق پہ آ بیٹھا

رازِ مسرّت

گُپھاوں میں بیٹھے ہوئے سادھوؤں سے

بھجن گاتے بیراگیوں سے

خود آگاہ ولیوں سے، روشن ضمیروں سے، دانشوروں سے

تہجّد گزاروں سے، شب زندہ داروں سے، عُشّاق سے

حیاتِ دوروزہ کے خوش قسمتوں سے

ہر اک سے غرض میں نے پوچھا

مسرّت کا کیا راز ہے، یہ کیا چیز ہے

اِسے کوئی انسان کس طرح حاصل کرے

ہر اک در سے لیکن معمّہ فزا خامشی کے سوا کچھ نہ پایا

کہ ناگاہ دل کی خلش نے سرِ راہ اک دن یہ منظر دکھایا

یہ دیکھا کہ اک گاؤں کی جھونپڑی میں (کہ جس کو حفاظت کی دیوار کی بھی

ضرورت نہیں تھی)

تنومند بچّے

پھٹی گیند کے پیچھے کلکاریاں مارتے بھاگتے ہیں

اور آنگن میں چُولھے کے نزدیک بیٹھی ہوئی

اُن کی ماں اُن کو اس طرح تکتی ہے گویا کہ فرض اپنا پورا ادا کر چکی ہو

لندن سے مانچسٹر جاتے ہوئے

نیلم کا فلک ہے تو زمرّد کی زمیں ہے
جو نقش بھی فطرت کا ہے فردوسِ بریں ہے

اس سامنے بیٹھے ہوئے گل رو ہی کو دیکھو
منظر کی انگوٹھی میں جڑا ایک نگیں ہے

ہر قد نے ہمارے لئے گاڑی ہیں صلیبیں
ہر سینۂ بے باک قیامت کا امیں ہے

اِن عاج کے جسموں کی ہیں کچھ اور بہاریں
صندل سے تراشا ہوا بُت اور حسیں ہے

ہر ساقِ بلوریں سے منوّر ہیں یہ راہیں
ہر ساعدِ سیمیں ہے کہ اک برقِ مبیں ہے

وہ شعلۂ الماس ہے کھلاتی ہے شگوفے
یہ مشعلِ افرنگ ہے جو دشمنِ دیں ہے

اِس نوکِ سناں سے چھدی بنیان کو دیکھو
کیوں قربِ قیامت کا یقیں ہے کہ نہیں ہے

وہ کانِ نمک ہند کی دوشیزہ ہے شاید
یہ ملکۂ طنّاز مگر لُعبت چیں ہے

اس قلزمِ صد رنگ کی ہر موج میں لیکن
اک درد کا نشتر سا مرے دل کے قریں ہے

چشم و لب و رخسار کے اس سیل میں پرتو
وہ محرمِ سازِ دلِ بے تاب نہیں ہے

چند سوال

کیسے بوجھوں من کی پہیلی میں مورکھ نادان
کانٹے بن کر سوچیں اُبھریں ہر ساعت ہر آن

چیونٹی بن کر ہر پل رینگوں ہر پل کچلا جاؤں
پھر بھی پربت سے اونچا ہے کیسے میرا مان

جھینگر کیوں راتوں کو جاگے کیا ہے اُس کی پیڑ
کس کے درشن کا مژدہ ہے چڑیوں کا اعلان

تتلی کیوں پھرتی ہے بے کل ڈالی ڈالی جائے
بھنورا کس کی پیت میں پاگل گھومے ہے ہلکان

جس نے دھرتی خون سے سینچی شہر کیے آباد
کیوں اس کا کوٹھا ہے سونا' کیوں ہے گھر ویران

کیوں ناگن کو روپ دیا جب چوم سکے نہ کوئی
مندر مسجد بنوا کر چھپ کہاں گیا بھگوان

کانٹوں کی کیوں چبھن نہ جائے جیون جائے بیت
پل بھر سے کیوں بڑھے نہ آگے پھولوں کی مسکان

میرے انگ پہ کیوں نہ پھوٹا میرے پاپ کا کوڑھ
میری پیت کی کیاری کو کیوں چاٹ گیا سرطان

جس کو میں نا سمجھوں میری سوچ میں کیوں کر آئے
میرے انگ سے آگے کیسے بڑھ جائے ارمان

چندر ماں کے ٹکڑے جب میں دھرتی اوپر دیکھوں
میری من کٹیا میں بیٹھا کون پڑھے قرآن

کس نے میرے سوچ بدن کو پہنایا احرام
میری روح کے منبر اوپر دیوے کون اذان

میں اپنے مالک کو ڈھونڈوں، رو رو دوں آواج
میں جس کا عبدل ہوں پرتو کون ہے وہ رحمٰن

غزالِ بیشہ

ہلاکت کے اس دشتِ سفاک میں بے خبر، ہم سفر
اُفق تا اُفق، تا بہ حدِ نظر
سلاسل ہیں یا خار ہیں
جاں کے آزار ہیں
ہر قدم پر یہاں، وحشتیں آندھیوں دہشتیں گرد بادوں کی صورت تھرکتی ہوئی
خواہشوں اور اُمنگوں کے حلقوم پر پاؤں دھرتی ہوئی ناچتی ہیں
یہاں دستِ اُمید پر مرگ کہسار ہیں۔ جاں کے آزار ہیں
یہاں پر بگولے ہیں اُڑتی ہوئی دھول ہے خاک ہے
سُلگتی دوپہریں ہیں گم گشتہ منزل کا پیچاک ہے
حقیقت کی نابینا آنکھوں کا خاشاک ہے
یہاں سینۂ عشق پر ریگ انبار ہیں۔ جاں کے آزار ہیں
یہاں پر اُمیدوں کا اک کارواں بھی سرِ منزلِ شوق پہنچا نہیں

یہاں پر کسی آنکھ نے چہرۂ دوست جی بھر کے دیکھا نہیں
یہاں پیار جذبوں کے گھر منہدم ہیں شکستہ ہیں مسمار ہیں
ہر قدم' ہر طرف جاں کے آزار ہیں

ایسے حالات میں دشتِ سفّاک میں' اے مری بے خبر ہمسفر
کیوں نہ اُس آہوئے لمحۂ زیست کو
جو وحشت زدہ ہے گریز آشنا ہے
تجھے بیشۂ اتفاقات میں آج سویا ملا ہے'
لپک کر' جھپٹ کر' پکڑ لے
ابھی جب کہ فتراکِ گیسو بھی ہے پُشت پر
ابھی جب کمانِ جوانی پہ تیرِ نظر راست ہے
ابھی جب کہ رُخسار تیرے چمن زار ہیں
بخت بیدار ہیں
اے مری ہمسفر' اے مری ہمسفر

چودہ اگست

گھر آنگن مہکایا تھا
آج کے دن تُو آیا تھا

ٹھوڑی اوپر تھا تارا
ماتھے چاند سجایا تھا

سچ کے چِٹے چولے پر
سبز آنچل لہرایا تھا

کِھل اُٹھا تھا ہر بوٹا
ہر پتّا مسکایا تھا

تیرے مُکھ اجیارے نے
رین کا منڈپ ڈھایا تھا

محلوں تیری خوشبو تھی
گلیوں تیرا سایا تھا

تیرا پیار اک بادل تھا
پورب پچھّم چھایا تھا

سوکھے دھانوں پر تو نے
امرت جل برسایا تھا

تیرے پاؤں کی مٹّی پر
میں نے سیس نِوایا تھا

آنکھوں تجھ کو چُوما تھا
سپنوں نین لگایا تھا

گھور اندھیاروں میں تُو نے
آشا دیپ جلایا تھا

سارے جگ کو چھوڑا تو
ایک تجھے اپنایا تھا

○

ایک جام اور اگر نامِ جوانی ہو جائے
جھٹپٹے کی یہ اُداسی بھی سہانی ہو جائے

جاتے جاتے وہ مجھے نام بتا دے اپنا
عین ممکن ہے مکمّل یہ کہانی ہو جائے

ایک جھونکا جو ابھی پہنچا ہے دستک دیتا
کیا خبر کوئی پیام اُس کی زبانی ہو جائے

یوں تو سایہ بھی گراں ہوتا ہے، لیکن کیا ہو
اپنی ارتھی بھی اگر آپ اٹھانی ہو جائے

جان قیمت نہیں اُس کی، پہ لگا دو پرتوؔ
کس کو معلوم ہے کل اور گرانی ہو جائے

O

غرفۂ ناز سے گر اس کا اشارہ ہو جائے
زندگی کا ہمیں ہر درد گوارا ہو جائے

کس کو معلوم ہے کب رات کا افسوں ٹوٹے
یک بیک ماہِ درخشاں کا نظارا ہو جائے

کون جانے کہ اٹھا دے کبھی چہرے سے نقاب
اور وہ دشمنِ جاں دوست ہمارا ہو جائے

یہ بھی ممکن ہے وہ آنگن میں اتر آئے کبھی
بُرجِ خاکی میں بھی رخشندہ ستارا ہو جائے

بے محابا کبھی آ جائے وہ صحنِ دل میں
بحرِ موّاجِ شبِ تارؔ کنارا ہو جائے

کچھ نہیں تو وہ اگر ایک جھلک دکھلا دے
زندہ رہنے کے لیے ایک سہارا ہو جائے

یہ بھی ممکن نہیں اے یار، تو اتنا کر دے
بزمِ عشّاق میں عزّت سے گزارا ہو جائے

O

یاں ظلم کی ہر شاخ کو پھلتے ہوئے دیکھا
کاغذ کی بنی ناؤ کو چلتے ہوئے دیکھا

چاروں طرف آثارِ قیامت نظر آئے
خورشید کو مغرب سے نکلتے ہوئے دیکھا

چوروں کی رفاقت ہوئی سلطان سے ایسی
تعظیم میں شحنہ کو سنبھلتے ہوئے دیکھا

قاضی ہی نے قزّاق کو دی پشت پناہی
منصف ہی کو انصاف نگلتے ہوئے دیکھا

جس شخص نے کل پہنا تھا قرآن کا جامہ
آج اس کو بھی ملبوس بدلتے ہوئے دیکھا

بیگانۂ پابوس تھا جو راہِ الم میں
اس کو کفِ افسوس ہی ملتے ہوئے دیکھا

رکتا ہے کبھی جبر سے مجبور کا رستہ
چشموں کو چٹانوں سے اُبلتے ہوئے دیکھا

وہ شخص کہ پتّھر کی تراشی ہوئی سِل تھا
اک بوسۂ ناگہ سے پگھلتے ہوئے دیکھا

اُس دورِ کرامات میں ہم جیتے ہیں پرؔتو
مطلب کا دیا پانی میں جلتے ہوئے دیکھا

○

میری آنکھوں سے درونِ شبِ یلدا دیکھو
سحرِ امروز سے نکلو رُخِ فردا دیکھو

کیسے مہتاب مری فکر کے گہنائے ہیں
اک گھڑی کو مری آنکھیں مرا چہرہ دیکھو

لوگ گلیوں میں نکل آئے کوئی خوف تو ہے
شاہراہوں پہ ہے کس بات کا چرچا دیکھو

فخرِ بے معنی کی زر دوز عبائیں پہنے
اپنی بہنوں کو سرِ عام برہنہ دیکھو

بھول جاؤ گے کہ اِس نام کی بستی تھی کوئی
اور دو چار برس گھر کا تماشا دیکھو

کس کو معلوم ہے کب آگ کا دریا بہہ جائے
سینۂ وقت میں پکتا ہوا لاوا دیکھو

سبز خوابوں کی کھلی دھوپ میں مدہوش نہ ہو
زرد طوفان کا بڑھتا ہوا سایہ دیکھو

میں کہ بزمِ مہ و انجم میں سدا رہتا تھا
مجھ کو تاریکیٔ شب میں کبھی تنہا دیکھو

صحنِ تخلیق میں بھی حبس بہت ہے پرتوؔ
اپنی تسکینِ جنوں کو کوئی صحرا دیکھو

○

اُسے چاہا جسے دیکھا نہیں تھا
اسے پوجا جسے سمجھا نہیں تھا

تمنّا تھی وہ اس کے لب نہیں تھے
مری خواہش تھی وہ دریا نہیں تھا

بالآخر رنگ لائی کوچہ گردی
وہاں پہنچا جدھر رستہ نہیں تھا

وہ دریا تھا مگر ریگِ رواں کا
وہ قلزم تھا مگر بہتا نہیں تھا

صنم تھا وہ حسین و سرو قامت
شجر تھا وہ مگر سایہ نہیں تھا

شبِ رفتہ پہ جب میں سوچتا ہوں
تو لگتا ہے کبھی سویا نہیں تھا

نہ گونجی تھی کبھی تنہائی اتنی
فضا میں ایسا سنّاٹا نہیں تھا

ہوا تھا وقت پر سکتہ بھی طاری
پہ لمحہ اس طرح ٹھہرا نہیں تھا

قیامت اس سے پہلے بھی اٹھی تھی
مگر دل اس طرح بیٹھا نہیں تھا

یہ پتّھر آج جو مارا ہے اس نے
ہزاروں میں کوئی ایسا نہیں تھا

وہ کیسی آگ تھی میں جس میں پرتوؔ
سلگتا تھا مگر جلتا نہیں تھا

○

وہ ناشناس تو برسوں کا آشنا نکلا
اِس ایک لمحے کا صدیوں سے سلسلہ نکلا

یہ کل کی بات فلک پر تھے ساتھ ہم دونوں
ہمارا رشتہ تو دنیا سے ماورا نکلا

وہ جس کو چومتی آئی ہے بندگی میری
چھپا ہوا تھا جو پتھر میں وہ خدا نکلا

لگا کہ ہم تو مسافر ہیں ایک منزل کے
گھروں کو جاتا ہوا ایک راستہ نکلا

مری نظر میں جو آہنگ قربتوں کا تھا
نگہ میں اس کی بھی کوئی نہ فاصلہ نکلا

دھڑک رہا تھا مرا قلب کیف حیرت سے
کہ اُس کا سازِ مژہ میرا ہمنوا نکلا

وصالِ شوق نے سرشار کر دیا لیکن
نہ تشنگی گئی دل کی نہ حوصلہ نکلا

○

زندہ رہنا کبھی آسان ہوا کرتا تھا
آدمی صاحبِ ایمان ہوا کرتا تھا

کس مسرّت سے گزرتی تھی وہ ہر رات کہ جب
اک حسیں صبح کا امکان ہوا کرتا تھا

اونچی محرابیں مکانوں میں ہوا کرتی تھیں
متصّل صحن سے دالان ہوا کرتا تھا

سب اقارب ہی ہوا کرتے تھے بستی کے مکیں
شاذ و نادر کوئی انجان ہوا کرتا تھا

صرف اک نام سے مل جاتے تھے صدیوں کے نشاں
ایک چہرہ بڑی پہچان ہوا کرتا تھا

مسجدوں میں نہ ہوا کرتی تھی مائک پہ اذاں
پھر بھی اللہ کا عرفان ہوا کرتا تھا

سبز جنگل سے سدا صاف ہوا آتی تھی
سانس لینے کا نہ سامان ہوا کرتا تھا

کیا زمانے تھے کہ بستی میں ہر آنے والا
ساری بستی ہی کا مہمان ہوا کرتا تھا

اب تو ہر شہر میں ہے فوج جہاں بانوں کی
پہلے صرف ایک جہاں بان ہوا کرتا تھا

کس قدر سہل ہوا کرتی تھی مشکل پہلے
ختم قرآن ہی ہر آن ہوا کرتا تھا

بچّے استادوں کے فرماں پہ عمل کرتے تھے
چار سو علم کا فیضان ہوا کرتا تھا

جانے کب چاند کی مخلوق یہ تحقیق کرے
اس زمیں پر کبھی انسان ہوا کرتا تھا

وقت نے چھین لی مجھ سے مری فطرت پرؔتو
پہلے میں حسن پہ قربان ہوا کرتا تھا

○

زندہ رہنا کبھی آسان ہوا کرتا تھا
آدمی صاحبِ ایمان ہوا کرتا تھا

کس مسرّت سے گزرتی تھی وہ ہر رات کہ جب
اک حسیں صبح کا امکان ہوا کرتا تھا

اونچی محرابیں مکانوں میں ہوا کرتی تھیں
متصّل صحن سے دالان ہوا کرتا تھا

سب اقارب ہی ہوا کرتے تھے بستی کے مکیں
شاذ و نادر کوئی انجان ہوا کرتا تھا

صرف اک نام سے مل جاتے تھے صدیوں کے نشاں
ایک چہرہ بڑی پہچان ہوا کرتا تھا

مسجدوں میں نہ ہوا کرتی تھی مائک پہ اذاں
پھر بھی اللہ کا عرفان ہوا کرتا تھا

سبز جنگل سے سدا صاف ہوا آتی تھی
سانس لینے کا نہ سامان ہوا کرتا تھا

کیا زمانے تھے کہ بستی میں ہر آنے والا
ساری بستی ہی کا مہمان ہوا کرتا تھا

اب تو ہر شہر میں ہے فوج جہاں بانوں کی
پہلے صرف ایک جہاں بان ہوا کرتا تھا

کس قدر سہل ہوا کرتی تھی مشکل پہلے
ختم قرآن ہی ہر آن ہوا کرتا تھا

بچّے استادوں کے فرماں پہ عمل کرتے تھے
چار سو علم کا فیضان ہوا کرتا تھا

جانے کب چاند کی مخلوق یہ تحقیق کرے
اس زمیں پر کبھی انسان ہوا کرتا تھا

وقت نے چھین لی مجھ سے مری فطرت پرتو
پہلے میں حسن پہ قربان ہوا کرتا تھا

○

اب عشق میں جان کون دے گا
جنگل میں اذان کون دے گا

اندھوں کے طویل قافلے میں
منزل کا نشان کون دے گا

پستی ہی اگر نہ دے سہارا
پربت کو اٹھان کون دے گا

ترکش ہی نہیں جو حوصلے کا
ہاتھوں میں کمان کون دے گا

شاہد ہی اگر رہے گا مجرم
قاضی کو بیان کون دے گا

جب کفر ہی وجہِ منزلت ہو
ایمان پہ دھیان کون دے گا

کھولے نہ اگر وہ خود پروں کو
طائر کو اُڑان کون دے گا

لوٹیں گے جو اس طرح سے حاکم
بے کس کو امان کون دے گا

شاعر بھی اگر خموش بیٹھے
جذبوں کو زبان کون دے گا

○

دیوارِ سنگلاخ میں در رائگاں گیا
اپنے لیے بنایا تھا گھر رائگاں گیا

لمحوں میں ایسا ٹوٹ کے بکھرا طلسمِ خواب
صدیوں کا انتظارِ سحر رائگاں گیا

پانی کی طرح جذب ہوا شور زار میں
دریائے چشم و سیلِ جگر رائگاں گیا

منزل ملی نہ کاوشِ پائے طلب گئی
افسوس زندگی کا سفر رائگاں گیا

راہیں مری حیات کی تاریک ہی رہیں
پرتو جمالِ نورِ قمر رائگاں گیا

○

اس دشت ہلاکت سے گزر کون کرے گا
بے امن خرابوں میں سفر کون کرے گا

ڈوبیں گے جو خورشید ابھرنے ہی سے پہلے
اس تیرگیٔ شب کی سحر کون کرے گا

چھن جائیں سرِ راہ جہاں چادریں سَر کی
اُس خانۂ ظلمت میں بسَر کون کرے گا

جس دور میں ہو بے ہنری وجہِ سیادت
اُس دور میں تشہیرِ ہنر کون کرے گا

اُڑ جائیں گے جنگل کی طرف سارے پرندے
مینارۂ لرزاں پہ بسر کون کرے گا

نوچیں گے اگر شام و سحر اُس کو مرے ہاتھ
اُس شاخ کو اے دوست شجر کون کرے گا

اِس خوفِ مسلسل میں گزر کس طرح ہو گی
سولی پہ ہر اک رات بسر کون کرے گا

تو بھی تو مرے پیار کا تھوڑا سا بھرم رکھ
خوں تیرے لئے ورنہ جگر کون کرے گا

مژدہ مجھے جینے کا بھلا کس نے دیا تھا
مجھ کو مرے مرنے کی خبر کون کرے گا

○

وہ نہ پہچانے یہ خدشہ سا لگا رہتا ہے
رُخ پہ اس کے نیا چہرہ سا لگا رہتا ہے

اپنے گھر میں بھی تو ہے چین سے سونا مشکل
چھت نہ گر جائے یہ کھٹکا سا لگا رہتا ہے

وہ زمیں خاک اُگائے گی عداوت کے سوا
پیار پر جس جگہ پہرا سا لگا رہتا ہے

بھیڑ چھٹتی نہیں اِس کُلبۂ احزاں سے کبھی
آرزوئیں ہیں کہ میلہ سا لگا رہتا ہے

صاف کتنا ہی کریں دامنِ قاتل کو حلیف
لوحِ تاریخ پہ دھبّا سا لگا رہتا ہے

تیرے آنے کی خوشی بھی نہیں ہوتی پرتو
تو چلا جائے گا دھڑکا سا لگا رہتا ہے

○

رہینِ جہلِ فضیلت مآب ہوتے رہے
خرد کے سارے سمندر سراب ہوتے رہے

فراقِ یار میں ہر اشک جرعۂ مے تھا
نشاطِ درد میں آنسو شراب ہوتے رہے

ہزاروں اس کی توانائیاں نہ کام آئیں
زمیں پہ چرخ کے کیسے عذاب ہوتے رہے

زمانہ جانبِ افلاک بڑھ گیا اور ہم
فدائے مرضیٔ عالی جناب ہوتے رہے

''تمام رات ترا جسم ہمکلام رہا''
تمام رات سوال و جواب ہوتے رہے

ہزاروں سال سے شبنم گُہر پروتی رہی
ہزاروں سال سے کانٹے گلاب ہوتے رہے

عدو نے مسندِ الفت پہ تمکنت پائی
تری گلی میں کھڑے ہم خراب ہوتے رہے

O

یہ حالت اور کتنے دن رہے گی
یہ صورت اور کتنے دن رہے گی

یہی حاکم رہیں گے گر ہمارے
حکومت اور کتنے دن رہے گی

رہی حالت یہی جمہور کی تو
قیادت اور کتنے دن رہے گی

اگر رہزن ہی بن بیٹھیں گے منصف
عدالت اور کتنے دن رہے گی

یہ دو نسلیں مسلسل پوچھتی ہیں
سیاست اور کتنے دن رہے گی

خرابی ہے اگر بنیاد میں تو
عمارت اور کتنے دن رہے گی

یہی بے اعتمادی ہے تو پرتو
شراکت اور کتنے دن رہے گی

○

اپنے مرکز پہ نہ پورا ہوا چکّر میرا
اجنبی ہاتھ بدلتے رہے محور میرا

میرے قالب کی شناسا نہیں ہیئت میری
اپنے سائے سے بھی بیزار ہے پیکر میرا

اس طرح قتل ہوا دوست میں گھر کے اندر
اک محافظ بھی کھڑا رہتا تھا باہر میرا

میرے سینے پہ تو دشمن کا کوئی زخم نہیں
میرے پہلو میں جو اترا ہے تو خنجر میرا

میں تو اب تک نہیں سیکھا ہوں زمیں پر چلنا
اور خلاؤں میں ہے چھایا ہوا شہپر میرا

کس کو بخشتا ہے خدایا مری قسمت لکھنا
کس کے ہاتھوں میں دیا تُو نے مقدّر میرا

میرے محبوب ہیں محنت سے جو سنولائے ہیں
ہے اسی واسطے دلدار بھی گھر گھر میرا

میں اسی خاک سے اٹھوں گا کبھی گل بن کر
رائیگاں جائے گا ہرگز نہیں جوہر میرا

میں وہ سلطان کہ گھٹتی ہے ریاست جتنی
اُتنا اُتنا ہی بڑھا کرتا ہے لشکر میرا

بندِ غم ٹوٹنے والا ہے کسی دم پرتو
ایسا لگتا ہے چھلکنے کو ہے ساغر میرا

○

مرے عمل پہ سزاؤں کو کون روکے گا
زمیں سے اُگتی وباؤں کو کون روکے گا

جو زیرِ دامن جاں بجھ گئی امید کی لو
اندھیری تُند گھٹاؤں کو کون روکے گا

نمو تو حسنِ طلب خیز کی نہاد میں ہے
چمن میں تنگ قباؤں کو کون روکے گا

اگر نہ چند شِکم سیر رک سکے تجھ سے
تو لاکھ بھوکے گداؤں کو کون روکے گا

تجھے ہزار مری بندگی قبول سہی
تری گلی کے خداؤں کو کون روکے گا

زمیں سے اٹھتے مسائل اگر نہ حل ہو پائے
فلک سے گرتی بلاؤں کو کون روکے گا

طبیب خود ہی اگر کشتۂ طلا بن جائے
زمین و زر کی وباؤں کو کون روکے گا

زباں کا نعرۂ حق روک بھی لیں درباری
دلوں سے اُٹھتی صداؤں کو کون روکے گا

ہزار خار دیار طلب میں ہوں پرتوؔ
جنوں میں آبلہ پاؤں کو کون روکے گا

○

میں پیار میں ترے کس کیف و کم کے ساتھ رہا
نشاطِ زخم بھی تیرِ ستم کے ساتھ رہا

نہ ہوتی روکشِ عالم بیاضِ غم ورنہ
جگر کا خون بھی نوکِ قلم کے ساتھ رہا

نشانِ راہ بھی تو ہی تھا عینِ منزل بھی
سو تیرا نام مرے ہر قدم کے ساتھ رہا

سجود میں بھی میں بھولا نہیں ترے ابرو
خمارِ دَیر بھی خاکِ حرم کے ساتھ رہا

درونِ خاک بھی خاموش کب تھا میں پرتوؔ
مرا وجود بھی گویا عدم کے ساتھ رہا

○

مٹّی میں ملا ہے خواب میرا
ذرّے ہوا آفتاب میرا

بیٹھا نہ کبھی غبار دل کا
برسا نہ کبھی سحاب میرا

صحرا میں رہی پکار میری
پتّھر سے رہا خطاب میرا

سوتے میں گزارا اپنا بچپن
روتے میں کٹا شباب میرا

کھلنے کو مچل رہا ہے کب سے
پتّھر میں دبا گلاب میرا

رستے میں کھڑا ہوں میں برہنہ
ہر راز ہے بے نقاب میرا

اب آخرِ وقت یہ کُھلا ہے
بے سود تھا پیچ و تاب میرا

اک عشق مرا سبق تھا پرتو
بس پیار تھا اک نصاب میرا

○

اے ساکنانِ دشتِ بلا دیکھتے رہو
چلتی ہے کس طرف کی ہوا دیکھتے رہو

سینے پہ آدمی کے رہی جبر کی یہ سِل
پھوٹے گی بستیوں سے وبا دیکھتے رہو

اٹھا ہے زور و شور سے جو دستِ احتساب
رہتی ہے کس کے سر پہ رِدا دیکھتے رہو

جس قتلِ نیم روز میں قاضی بھی تھا شریک
پائے گا کون اس کی سزا دیکھتے رہو

نخوت کے آسماں سے برہنہ زمین پر
گرتے ہیں اور کتنے خدا دیکھتے رہو

گھِر گھِر کے آ رہی ہے شمال و جنوب سے
برسے گی کس گھڑی یہ گھٹا دیکھتے رہو

پہنچیں گے اس کے بندِ قبا پر کبھی یہ ہاتھ
کچھ دیر اور رنگِ قبا دیکھتے رہو

زاغ و زغن بھی گِرد ہیں پرتو رقیب کے
مقبول ہو گی کِس کی دُعا دیکھتے رہو

○

اک شعلے کی صورت میں نظروں سے گزر جاتا
لمحے کو سہی لیکن ماحول نکھر جاتا

سناٹوں نے گھیرا تھا اس طرح سے بستی کو
پتّے سے ٹھٹھک جاتا میں سائے سے ڈر جاتا

تاریکی و گمراہی خاموشی و جاں کاوی
ہر بار نیا دشمن ملتا میں جدھر جاتا

اِن زیست کی چوٹوں نے کیوں اتنی کسر چھوڑی
اب یہ بھی ہے اک حسرت پورا ہی بکھر جاتا

تنہائی میں تاریکی، گر اتنی نہ بڑھ جاتی
کیوں چھوڑ کے دنیا کو میں سوئے قمر جاتا

منزل کوئی کیوں کھوتا، اک شب کی رفاقت میں
تم اپنے سفر جاتے میں اپنے سفر جاتا

تھا اُس کا اشارہ بھی اس کھیل میں ورنہ میں
کیوں دار پہ چڑھ جاتا آتش میں اتر جاتا

ہوتی نہ طبیعت میں پرتو مری بے رنگی[1]
میں خاکۂ الفت میں رنگ اور بھی بھر جاتا

---

1 راہِ طریقت میں مخصوص ریاضات کے بعد ایک خاص روحانی کیفیت

حکایتِ شب

.... چنانچہ سرِ شام ہم سب کسی خاندانِ فرنگی سے بہرِ ملاقات نکلے

یہاں میرا ہم سب سے مطلب ہے وہ دوسرے ہم وطن اور پڑوسی

کہ جو ملکِ افرنگ کی اُس بڑی جامعہ میں حصولِ زرِ علم و دانش کو آئے

ہوئے تھے

کسی سے یہ مطلب ہے ہم کو خبر تک نہیں تھی کہ ہم سب کہاں جارہے ہیں

کہاں کس کو کس شخص کی میزبانی ملے گی

بہر حال یہ طائفہ اجنبی میہمانوں کا اک درمیانے سے گھر میزبانوں ہی کی رہنمائی

میں پہنچا

وہاں ہم سے پہلے بھی کچھ لوگ موجود تھے

روایاتِ بے گانگیٔ فرنگی میں بستہ

طنابوں میں برفیلے ٹھٹھرے ہوئے، یخ زدہ، موسموں کی مُقیّد

مگر جن کے چہروں پہ اُن کی معیشت کے رسمی شگوفے کھلے تھے

تعارف کی اک مختصر، تیز، ٹھنڈی سی گردان

سوا آخری نام کے آخری حرف کی ڈوبتی چند لہریں

سوا آخری ہاتھ کے کھردرے چند ریزے

مِرے حافظے میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا

چنانچہ تعارف کے سنگین فرشوں کو پھر سے کریدا تو دیکھا

بہت سخت تھی ہر سطح اور ناخن بہت نرم تھے

اس اثنا میں اک خانمِ میزباں دونوں ہاتھوں میں سینی اُٹھائے

نبیذِ مصفّا و گلرنگ کے کچھ بلوریں پیالے سجائے

بصد ناز و انداز آئیں.......

ابھی اس نبیذِ مصفّا کے دو چار چکّر ہوئے تھے

کہ بوسیدہ رسموں کی اونچی فصیلیں

تعصّب کے تاریک زنداں

تکلّف کی چکنی منڈیریں

تصنّع کی پُرخار باڑھیں

سراسر یہ سب گر گئیں اور سب اجنبی ہم وطن بن گئے

چینی کی قاب میں بیف برگر

چمکدار چینی کی اک قاب میں بیف برگر کی پھولی ہوئی چکنی شفاف پَرتوں
میں عنابی تحریر
چٹانوں میں مرمر کی گویا کوئی سُرخ پتّھر کی موٹی سی چادر دبی ہو
مری اشتہائے شکم باوجود اپنی شدّت کے چکرا گئی
وہ چینی کی قاب اک بڑی گول اسٹیج کی طرح آہستہ پھرنے لگی
اور مرمر کی بے جاں پہاڑی میں جاں پڑ گئی
مطعمِ میکڈانلڈ میں بیٹھے پیر و جوان وُہ سگانِ گرسنہ لگے
سگانِ گرسنہ کہ جو پچھلی شب اپنی مردانہ حیوانیت اپنے رخ پر سجائے
کسی مردہ' بے روح' بے جان عورت کا ننگا بدن چاٹتے تھے
یکایک نگاہوں میں نائٹ کلب کا وہ سارا سماں پھر گیا
اور اُس بیف برگر سے' کھیرے کی قاشوں سے متلی' سی ہونے لگی

قاتل نیلگوں

وطن میں خبر یہ چھپی جا بجا
کہ اِس ملک کا اک جواں دل زدہ صاحبِ درد شاعر
بتاریخ اکیس جولائی گیارہ بجے رات پیرس سے لوزین[1] جاتے ہوئے
بس میں مارا گیا
سُنا ہے کہ قاتل نہیں مل سکا ہے
وہ روپوش ہے
پولیس محوِ تفتیش ہے
کچھ عرصے کے بعد اک ادب کے مورّخ نے تحقیق کی خوردبیں سے جو دیکھا
تو شاعر کی اِک ہمسفر ہم نشیں، سادہ رو، کم سخن، تُرک خاتون کے ہاتھ پر،
خوں کے دھبّے ملے
نیلگوں۔ نیلگوں۔ نیلگوں

---

1 سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر

اہلِ افرنگ سے کہہ رہا ہوں[1]

دیارِ فرنگی کی اک جامعہ کے بُک اسٹال پر ایستادہ ہوں اور
اہلِ افرنگ سے کہہ رہا ہوں
مِرے دیس میں تو کسانوں کی محنت پہ پیروں کی اور پیر زادوں کی
عیاشیاں رنگ لائیں
مِرے دیس میں کارخانے کے مالک نے اک لقمۂ نان مزدور کی جھونپڑی
میں نہ چھوڑا
مِرے دیس میں تو کشاورز نے اپنے بچوں کو بھوکا سلایا
مِرے دیس میں عندلیبِ خرد کی زباں کو تراشا گیا
مِرے دیس میں تو ذہانت کے ہنستے ہمکتے ہوئے طفل کو زندہ گاڑا گیا
مِرے دیس میں طیلسانِ خرد کو سرِ رہ وڈیروں نے ٹکڑے کیا
وطن کی محبت مِرے دیس میں اپنی دہلیز پر اپنے بیٹوں کے ہاتھوں سے رسوا ہوئی
مِرے دیس میں دستِ تعمیر کو کُند تلوار سے برسرِ عام کاٹا گیا

1 یہ نظم مانچسٹر یونیورسٹی کے قیام کے دوران ایک طویل و غیر مختتم مباحثے کے پسِ منظر میں کہی گئی جس میں برطانیہ کے علما کا دعویٰ تھا کہ ان کا ملک دنیا میں وہ آئیڈیل فلاحی ریاست ہے جہاں عالمی جنگوں میں بھی کوئی شخص بھوکا نہ مرا چونکہ ہر شخص کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور آج بھی ہوتی ہیں۔ اس پر شاعر کی دلیل یہ تھی کہ قحبہ گری تو عموماً بھوک اور شدید افلاس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ تھا تو آپ کے ملک میں قحبہ گری اس طمطراق سے کیوں ہوتی ہے۔

مِرے دیس میں خواہشِ آشتی سازشوں کے سرابوں میں پیاسی پھری

مِرے دیس میں قومی خوابوں کے آنچل سیہ کاریوں کی ببولوں پہ پُرزے ہوئے

مِرے دیس میں حاکموں نے فراعین کی صورت سے اپنے لذائذ کی

قربان گاہوں پہ بہنوں کی عصمت چڑھائی

مِرے دیس کے بھولے لوگوں کے معصوم جذبات نیلام گھر میں سجائے گئے

اُن کی بولی لگی

مِرے دیس میں تو فریبوں کے اندھے کنویں میں تمنّائے فردائے روشن سسکتی رہی

مِرے دیس میں رہنماؤں نے جبر و تشدّد کے خنجر سے جمہور کی شہ رگیں کاٹ دیں

مِرے دیس میں تو غلامی کے القصہ سارے عواقب رہے

تو پھر عصمتیں بھی بکیں اور جسموں کی سوداگری بھی ہوئی

قحبہ خانے چلے

مگر تم تو آزاد تھے اور ہمیشہ سے آزاد تھے

تمہارا وطن تو فلاحی تصوّر کا آدرش تھا

تمہاری زمیں سے تو جمہوریت اور سماجی مساوات کے صاف چشمے بہے

تمہیں فخر ہے سرزمیں پر تمہاری کبھی کوئی انساں نہ بھوکا مرا

تو کیوں کس طرح بیٹیوں نے تمہاری سرِ عام یہ شرمگاہیں

رسالوں کے رنگین اوراق پر مصر کے ہندوانے کی قاشوں کی صورت سجا دیں

بتاؤ

مِرے دیس میں تو غلامی رہی اور غلامی کے سارے عواقب رہے

کتبۂ ترکِ محبت

کبھی وُہ زمانہ تھا جب تیری قربت کی مہکار میری سانسوں پہ سایہ کناں تھی
ترے وصل کے آبشاروں میں مدہوشیاں تھیں
محبت سے لبریز امنگوں کی سرگوشیاں تھیں
دھڑکتے دلوں کی بلانوشیاں تھیں
ہر اک سایہ رنگین لگتا
سرابوں میں بھی موجِ کوثر چمکتی
ہر اک دائرہ تیری بانہوں کا خم تھا
مجھے اپنا تاریک کمرہ بھی رشکِ ارم تھا
مگر اب کہ وہ وقت، چاہت کی دہلیز پر بال کھولے ہوئے
کھوئے بچے کی صورت سے روتا ہوا ہچکیاں لے رہا ہے
یہی اک حقیقت مرے واسطے وجہِ آسودگی ہے
کہ اس مرقدِ غم پہ ترکِ محبت کا کوئی پرانا، روایت زدہ رسمی سنگین کتبہ نہیں ہے

وارفتگی

یہ بس ایک میداں تھا جس میں ہمارا لُٹا قافلہ شام کو آکے اُترا
کوئی جسم ایسا نہ تھا جس پہ زخموں نے تحریر چھوڑی نہ ہو
مگر پھر بھی ہر شخص خوش تھا کہ کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے
یہیں پر ہمارے قبیلے کے سردار نے یہ کہا تھا
یہ میداں تمہارا ہے
تم اس کے حقدار ہو
اس میں خیمے لگاؤ
کھلا آسماں اب تمہارا ہے
چمکتی ہوئی دھوپ کا اب تمہارے سوا کوئی مالک نہیں
تو وہ ہی لُٹا قافلہ اپنے گھاؤ بھلا کر نئے عزم سے کِھل اُٹھا تھا
مگر آج خیموں کے چاروں طرف کوہ آسا فصیلوں نے جب
دھوپ بھی روک دی ہے
ہواؤں کو بھی کوئی رستہ نہیں ہے
تو میرا جواں ہوتا بیٹا عجب طنز سے پوچھتا ہے
بتاؤ تو بابا
تمہارے قبیلے کے سردار نے کیا کہا تھا!

○

بدل دیا ہے زمانے نے ہر چلن اپنا
زبان اپنی رہی اب نہ پیرہن اپنا

غبار ہو کے اُڑے چار سُو تو یاد آیا
چلے تھے ہم بھی دکھانے کو بانکپن اپنا

شبِ فراقؔ زباں سے اگرچہ کچھ نہ کہے
فسانہ کہتی ہے بستر کی ہر شکن اپنا

ہوا نے بویا ہی کیا ہے کہ ہم اسیروں سے
خراج لینے کو موجود ہے گھٹن اپنا

نہیں ضرور کہ تابع ہو مہرِ رخشاں کی
مزاجِ حسن جدا رکھتی ہے کرن اپنا

○

دنیا جو سناتی ہے حکایت نہیں ہوتی
جو آنکھ دکھاتی ہے حقیقت نہیں ہوتی

ہے دیدۂ بے نُور بناتا ہے ہیولے
چہروں کی وگرنہ کوئی صورت نہیں ہوتی

ہم زیست کے کاموں میں ہیں اس طرح سے غافل
مرنے کے لیے بھی کبھی فرصت نہیں ہوتی

وہ آپ سمجھ لیتا ہے دل کا مرے احوال
مجھ کو کبھی کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی

رونے سے بھی دلگیر ہی رہتا ہوں ہمیشہ
ہنسنے سے بھی بشّاش طبیعت نہیں ہوتی

غم اتنے دیے ہیں مرے محبوب نے مجھ کو
دشمن سے بھی اب کوئی عداوت نہیں ہوتی

وہ اب بھی اُسی طرح سے ملتا ہے سرِ بزم
آنکھوں میں ذرا سی بھی خجالت نہیں ہوتی

ہر رات سمجھتا ہوں مری آخری شب ہے
اور صبح کروں شام، یہ حالت نہیں ہوتی

اک خار کہ پہلو میں کھٹکتا ہے مسلسل
اک درد کہ جس کی مجھے عادت نہیں ہوتی

ٹوٹے ہیں تصوّر کے مرے آئنے اتنے
اب آنکھ کو پرتو کوئی حیرت نہیں ہوتی

○

بیداریوں میں دیدۂ خوش خواب لے گیا
کس کس جگہ جزیرۂ شاداب لے گیا

ہم کو زمیں پہ نیند بھی گہری نہ آ سکی
لطفِ شبِ سیاہ بھی مہتاب لے گیا

اس گھر کی چھت کو تند ہوا لے گئی اڑا
دیوار و در سمیٹ کے سیلاب لے گیا

کن زاویوں میں لے گئی دل کی لگن مجھے
کن دائروں میں حلقۂ احباب لے گیا

دشت و جبل میں جب ہوئی مشکور سعیٔ فکر
صحنِ حَرم میں سجدۂ محراب لے گیا

روشن رہی فراق میں امید کی کرن
کن ظلمتوں سے کرمکِ شب تاب لے گیا

ساحل پہ بیٹھے موج اُڑاتے ہیں ناخدا
کشتی کو کب کا دورۂ گرداب لے گیا

○

فقیرِ خیر ہیں ہم طبعِ سادہ رکھتے ہیں
عدو کے واسطے بھی دل کشادہ رکھتے ہیں

مروّتوں کی روایات' واسطے سب کے
توقّعات سے کافی زیادہ رکھتے ہیں

ہماری فکر عبارت ہے ذہن سے اپنے
ہم اپنے جسم پہ اپنا لبادہ رکھتے ہیں

مقیمِ سایۂ پندار ہیں' گھڑی دو میں
روانگیَ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

مجال کیا ہے جو شہ بھی کرے رخِ بے جا
کہ ہم وزیر سے آگے پیادہ رکھتے ہیں

مگر نشہ ہے کہ نسلوں کو چڑھتا جاتا ہے
نہ جام رکھتے ہیں پرتو نہ بادہ رکھتے ہیں

○

کارِ الفت اور اتنی غفلت میں
زندگی کٹ گئی حماقت میں

ایسا لگتا ہے اُڑ گئے یک دم
جتنے لمحے تھے ایک ساعت میں

وصل کی رات بھی تمام ہوئی
لمسِ نا آشنا کی حیرت میں

موسموں نے بھی ڈھا دیا اس کو
کچھ خرابی بھی تھی عمارت میں

اس کو دیکھا نہیں نظر بھر کے
شب بسر ہو گئی محبت میں

وہ بھی تنہا ہے میں بھی ہوں تنہا
ہو ملاقات کیسے خَلوت میں

حسن کی بولیاں سرِ بازار
عشق کے فیصلے عدالت میں

کون پوچھے کہ لکھنے والے نے
لکھ دیا کیا ہماری قسمت میں

○

دردِ الفت زبان سے نکلا
ایک کانٹا تھا جان سے نکلا

میرے سینے میں چھپ کے بیٹھا تھا
چور میرے مکان سے نکلا

کوہساروں کے بیچ اک چشمہ
گویا ریشم چٹان سے نکلا

بات کوئی زبان سے نکلی
تیر جیسے کمان سے نکلا

تھے شکاری زمین پر سارے
شیر اوپر مچان سے نکلا

آنکھ سے شاعروں کی ہر آنسو
شاعروں ہی کی شان سے نکلا

○

چڑھے ہوئے تھے جو سورج اتر گئے اک دن
عروج کے بھی زمانے گزر گئے اک دن

وہ کیسے نخوت و شوکت کے لوگ تھے، آخر
خموش خانۂ عُزلت میں مر گئے اک دن

سمندروں کی سی پہنائی رکھنے والے بھی
بس ایک بوند سے یکدم بپھر گئے اک دن

کبھی جو کیفِ ملاقات سے نہ سیر ہوئے
وہ دل بھی وصلِ مسلسل سے بھر گئے اک دن

تمام عمر میں جن کو چُنا تھا پلکوں سے
وہ سارے خواب گھڑی میں بکھر گئے اک دن

پلِ صراط تھا ہم کو جو فاصلہ پرِتو
بغیر سمجھے ہم اس سے گزر گئے اک دن

○

اگر کرے تو کوئی کیسے آسرا دل کا
گھڑی گھڑی ہوا کرتا ہے سانحہ دل کا

نہیں ہے کوئی بھی شہ راہ موردِ الزام
جو گھر کے صحن میں ہو جائے حادثہ دل کا

حریمِ جاں میں بھی جس کی نوا نہ پہنچی تھی
وہ راز پردۂ سیمیں پہ کھُل گیا دل کا

تباہ ہم کو کیا تھا تو رقّتِ دل نے
سو آج دھات بھی اِک جزو بن گئی دل کا

اٹھا جو درد، بھروسا بھی اٹھ گیا دل سے
یہی روش ہے تو پھر کون آشنا دل کا

”گلہ ہے شوق کو جب دل میں تنگیٔ جا کا“[1]
رہے گا دیکھئے کب تک بندھا ٹکا دل کا

سمندروں کے تلاطم میں ناتواں کشتی
ہوائے تند میں کمزور جھونپڑا دل کا

شریک زیست تھا ہمدم تھا ہم نشیں تھا وہ
مٹا نہ پھر بھی کسی طور فاصلہ دل کا

اُسے یہ دکھ ہے کہ رستے میں ساتھ چھوڑا ہے
مجھے یہ غم ہے کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

کسی طرح کوئی صورت نظر نہیں آتی
جگہ جگہ سے شکستہ ہے آئنہ دل کا

کتابِ زیست کا عنوانِ دل کُشا یہ ہے
سنہرے لفظوں میں لکھیے یہ واقعہ دل کا

---

1 غالبؔ کے مصرعے ”گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا“ میں تصرف۔

بندھا ہے رختِ سفر آج، تو یہ حسرت ہے
جہانِ ذوقِ سفر دیکھتا کوئی دل کا

نہ پوچھ درد میں کتنا تھا متصّل دل سے
رہا ہے دور کا اک جس سے واسطہ دل کا

خلافِ ضابطۂ عہد تھا مگر پرتو
قبول کرنا پڑا پھر بھی فیصلہ دل کا[2]

---

2 یہ اشعار انجو پلاسٹی آپریشن پر آئی سی یو میں موزوں ہوئے۔

○

کوئی بگولا سا اٹھتا دکھائی دیتا ہے
کہیں قریب ہی صحرا دکھائی دیتا ہے

بجز غبار مجھے کچھ نظر نہیں آتا
وگرنہ خواب میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے

یہ چشم وا ہے کہ جاتی ہے پیشِ منظر تک
جو بند ہو پس فردا دکھائی دیتا ہے

نہ چاند ہے کہ وسیلہ ہو دل بہلنے کا
نہ چاند سا کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

سپرد کر کے جہاں بانی اپنے بندوں کو
خدا تو عرش پہ سویا دکھائی دیتا ہے

درست کرنی پڑی ہے مجھے بھی سمت اپنی
اگرچہ مجھ کو تو قبلہ دکھائی دیتا ہے

مجھے تلاش ہے خود خدّ و خال کی اپنے
مجھے کہ شہر کا نقشہ دکھائی دیتا ہے

تعصّبات کی عینک اتار کر دیکھا
عدوئے جاں بھی فرشتہ دکھائی دیتا ہے

شبِ فراق کے گہرے اندھیرے میں پرؔتو
بس ایک رنگ، جو اجلا دکھائی دیتا ہے

○

دُکھ تو مُضمر ہی میری جان میں تھے
میرے دشمن مرے مکان میں تھے

دشتِ وحشت بتا کہاں ڈوبے
وہ جزیرے جو میرے دھیان میں تھے

سَرنگوں بیٹھے آج سوچتے ہیں
کیسے تیور تری اُٹھان میں تھے

نا خُدا سے گلہ نہ موسم سے
میرے طوفاں تو بادبان میں تھے

سب شکاری بھی مل کے کیا کرتے
شیر بیٹھے ہوئے مچان میں تھے

یہ قصیدے جو تیری شان میں ہیں
یہ قصیدے ہی اُس کی شان میں تھے

کیا سمجھتے کہ دُھوپ کیسی ہے
وہ جو رنگین سائبان میں تھے

کوئی ثابت نہیں ہوا اب تک
کتنے دعوے ترے بیان میں تھے

بُجھ گیا دل، ہوا کی زد پر تھا
چاند تارے تو آسمان میں تھے

یہ جو تیری وفا کے گاہک ہیں
یہ ابھی دُوسری دوکان میں تھے

تیشۂ وقت ہی بتائے گا
کتنے چہرے ابھی چٹان میں تھے

لوگ کہتے ہیں جنگ ختم ہوئی
تیر سارے ابھی کمان میں تھے

میں ہی اپنا رقیب تھا پرتوؔ
میرے جذبے ہی درمیان میں تھے

○

یہی ہے تجھ سے مرا التماس رہنے دے
گذشتہ لمحے کی کوئی اساس رہنے دے

نہ توڑ رشتۂ اُلفت کو اس طرح تو نہ توڑ
کبھی تو ملنے کی موہوم آس رہنے دے

نہ گھول تلخئ پیدائی سحر اس میں
تعلّقِ شبِ غم کی مٹھاس رہنے دے

نہ چھین ہدیۂ شامِ فراق مجھ سے نہ چھین
یہ ارمغانِ اَلم میرے پاس رہنے دے

تری گلی کا حوالہ سرِورق مل جائے
کتابِ زیست میں وہ اقتباس رہنے دے

نہ ڈال معرضِ شک میں خلوص کو میرے
مری وفا کو قرینِ قیاس رہنے دے

مرے خیال سے خوابوں کے پیرہن نہ اُتار
مرے بدن پہ کوئی تو لباس رہنے دے

○

خوارِ بود و زبونِ ہست رہا
میں خداؤں میں خود پرست رہا

بالادستی اُصول کی چاہی
زیردستوں کا زیردست رہا

وہ تھا اپنی خدائی میں غافل
میں بھی اپنی خودی میں مَست رہا

ہر گھڑی بکھرا جاں کا شیرازہ
ہر گھڑی ایک بندوبست رہا

میری جاں آشنائے ریخت رہی
میرا دل مائلِ شکست رہا

○

عجب جہانِ تضادات میرے اندر ہے
کہ ہونٹ خشک ہیں سینے میں اک سمندر ہے

فصیلِ شہر پہ مامور مفتیانِ کرام
محل سراؤں میں خوابیدہ سارا لشکر ہے

میں اس نمی پہ زمیں کی یہ کس طرح مانوں
کہ قحط میرے لئے ہی سدا مقدّر ہے

گراں ہے میرے لئے اپنے قاتلوں کی شناخت
کہ میرے سامنے جو بھی ہے اک پیمبر ہے

نگارِ صبح کا چہرہ نظر نہیں آتا
فضائے عرصۂ دوراں بڑی مکدّر ہے

خدا ہی رحم کرے اُس کی جان مسکیں پر
بدست کودکِ کج فہم اِک کبوتر ہے

جگر سے اپنے تراشا تھا اک خُدا میں نے
کھُلا یہ روزِ قیامت کہ وہ بھی پتّھر ہے

قتیلِ نسخۂ نو ہے یہ شہر زندہ دلاں
ہر اِک طبیب ہمارا تو کیمیا گر ہے

رسولِ وقت ہوں پرؔتو یہ دیکھتا ہوں مَیں
اُفق پہ حشر کے دن کا مہیب منظر ہے

○

کھڑی فصل خواہش کی جل جائے گی کس طرح مان لوں
گھٹا بن کے وہ آگ برسائے گی کس طرح مان لوں

جو پلکوں میں قُلزم سمیٹے رہی اور چھلکی نہیں
وہ آنکھ ایک آنسو سے بھر جائے گی کس طرح مان لوں

یہ کہتا ہے میرا ضمیر اپنی اقدار کی لاش پر
مجھے حق پرستی ہی ڈس جائے گی کس طرح مان لوں

شگوفے مری چاہ کے اس کے چرنوں میں کملائیں گے
وہ دیوی بھی پتّھر کی ہو جائے گی کس طرح مان لوں

سرِ منزلِ غم ہی ڈوبے گا دل کیسے باور کروں
یہ شمع سرِ شام بُجھ جائے گی کس طرح مان لوں

دہکتی ہوئی آگ ملبوس اُمید میں ڈال کر
وُہ بدلی بھی پرتو گزر جائے گی کس طرح مان لوں

○

اندھیرے رستوں میں رہنما ہے مگر کہاں ہے
زمانہ کہتا ہے تو خُدا ہے مگر کہاں ہے

ہر ایک خُوشبو سے تیری خوشبو الگ ہے گویا
تمام رنگوں سے تو جُدا ہے مگر کہاں ہے

مِرے بدن میں رواں ہے میرے لہو کی صُورت
دھڑکتے دل کی مرے صدا ہے مگر کہاں ہے

مِرے خیالوں میں بس رہا ہے مگر کدھر ہے
مِرے خیالوں سے ماورا ہے مگر کہاں ہے

ازل سے سانسوں میں گونجتی ہیں صدائیں تیری
ہزاروں صدیوں کا آشنا ہے مگر کہاں ہے

اُبھر رہا ہے نوائے بیچارگاں کی صُورت
مِرے لبوں پر مِری دُعا ہے مگر کہاں ہے

مری طلب کی ہے تو ہی منزل مگر کدھر ہے
مِری محبت کا مدّعا ہے مگر کہاں ہے

جو میَں گمانِ جلی کا پرتو حقیر مظہر
تو ہی حقیقت کی انتہا ہے مگر کہاں ہے

○

یہ جھوٹے وعدوں کا سلسلہ اَب نہیں چلے گا
منافقت کا معاملہ اَب نہیں چلے گا

تمہاری فکرِ ضعیف روئے گی مُنہ چھپا کر
جوان قدروں پہ قہقہہ اَب نہیں چلے گا

ہے اگلے فرسنگ پر درخشاں سحر کا سورج
اندھیری راتوں کا قافلہ اَب نہیں چلے گا

بہت شکستہ سہی یہ دیوار ہم نے مانا
ہمارے آنگن سے راستہ اَب نہیں چلے گا

عمل ہر اِک کا بتائے گا اُس کا اصل منصب
نَسَب سے منصب کا سلسلہ اَب نہیں چلے گا

غریب و مُفلس کی پائمالی بتا رہی ہے
یہ غاصبانہ معاشرہ اَب نہیں چلے گا

○

اُجلی اُجلی دھوپ میں سایا لگتا ہے
چاند کا چہرا میلا میلا لگتا ہے

تم جیسے بھی ہاتھ چھڑا کر جائیں تو
جیون کا ہر رشتہ جھوٹا لگتا ہے

جس انگنائی میں تم ہی تم ہوتے تھے
اس میں اب یادوں کا میلا لگتا ہے

پہلے کی یہ راتیں کٹ تو جاتی تھیں
اب تو ہر ہر لمحہ ٹھہرا لگتا ہے

ایک تمہارے کمرے پر موقوف نہیں
سارا گھر ہی سونا لگتا ہے

یہ بتلاؤ ہم کو چھوڑ کے جانے پر
تم کو تنہا تنہا کیسا لگتا ہے

اتنے چہرے خاک میں رُلتے دیکھے ہیں
انساں مٹّی کا اِک پُتلا لگتا ہے

دیکھو تم سے پہلے آ کر کون ملے
اُس نگری کب کِس کا پھیرا لگتا ہے

○

مساجد میں اذاں ہوتے ہوئے بھی
بھٹکتا ہوں نشاں ہوتے ہوئے بھی

مِرا ہی پیرہن ہے پارہ پارہ
ضمیرِ کن فکاں ہوتے ہوئے بھی

قیامت آ پڑی ہے آدمی پر
زمین و آسماں ہوتے ہوئے بھی

اندھیرا چھا گیا ہے راستوں پر
فلک پر کہکشاں ہوتے ہوئے بھی

تمازت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے
سروں پر سائباں ہوتے ہوئے بھی

ہر اِک خاموش بیٹھا دیکھتا ہے
دہن اندر زباں ہوتے ہوئے بھی

سمجھتے ہیں کہ ہم بے خانماں ہیں
اِک اپنا آشیاں ہوتے ہوئے بھی

○

غم اٹھایا ہے ترے پیار میں کتنا کتنا
سانحہ جان پہ گزرا ہے تو کیسا کیسا

ایک صورت جو نظر آتی ہے بستی بستی
ایک چہرہ جو لئے پھرتا ہے صحرا صحرا

توڑ دیں تند ہواؤں نے طنابیں ساری
خاک سے لگ گیا امیّد کا خیمہ خیمہ

وقت کی شاخ پہ بھیگا ہُوا کپڑا ہُوں میں
جس سے ٹپکے ہے مِری جان کا قطرہ قطرہ

کیسی شب ہے کہ درختوں پہ پرندے جاگے
سِسکیاں لیتا اُٹھا خواب سے بچّہ بچّہ

اپنی تالیف کو اَب مانگے ہے دفتر دفتر
وہ کہانی کہ جو مرقوم ہے چہرہ چہرہ

خواب کے ایسے مناظر ہیں نظر پر طاری
شہر بیدار نظر آتا ہے سویا سویا

ایک ٹھوکر تھی سرِ منزلِ غم کھائی تھی
ہر قدم آج تلک پڑتا ہے بہکا بہکا

ضبط کے حکم نے زخمی کیا پہلو پہلو
شکوۂ عشق سِوا پھیلا ہے سینہ سینہ

مَیں وہ سرکش ہُوں کہ پیوندِ زمیں بھی ہو جاؤں
آسماں پر ہو مِری خاک کا ذرّہ ذرّہ

نردبانِ حسن

کُرتے کا گلا کُھلا ہُوا تھا
بدلی سے وہ چاند جھانکتا تھا

پتّھر کی سفید سِل پہ جیسے
ریشم کا گلاب کِھل رہا تھا

چاندی کا طباق تھا اور اس میں
سونے کا تُرنج سا دھرا تھا

چلمن سے وہ دُھوپ چَھن رہی تھی
پردے سے وہ مہر اُبھر رہا تھا

فانوس میں شمع سی تھی روشن
ڈیوٹ پہ دیا سا جل رہا تھا

ڈوبا تھا یہاں پہ کیسے سورج
کیسے وہ طلوع ہو رہا تھا

نلتر[1] کی حسین وادیوں پر
اک مرغِ زرین اُڑ رہا تھا

تیمور سا اک عظیم فاتح
جو کرّۂ ارض پر کھڑا تھا

یا صحنِ چمن کے بیچ کوئی
بُستاں کا انار چھوٹتا تھا

یا شاخِ بلند پر کبوتر
بیٹھا سوئے عرش دیکھتا تھا

تھا حور کا عرش پر وہ نوزاد
جھولے میں ہمک ہمک رہا تھا

یا خُلدِ بریں سے اک پیمبر
خالق کا پیام دے رہا تھا

---

1 گلگت کی اک حسین وادی

یا طاقِ نمو پہ ٹھوڑی رکھّے
اک طفلِ شباب ہنس رہا تھا

حوّا کے گلے میں بانہیں ڈالے
آدم کا طلسم جاگتا تھا

مُطرب کا وہ نغمۂ مجسّم
شاعر کا خیالِ مہ لقا تھا

عارف کے لیے کمالِ عرفاں
سالک کو چراغِ رہنما تھا

قوسوں میں، حسین دائروں میں
اک نقشۂ لامکاں کھنچا تھا

یا روئے صبیح پر سحر کے
اک رات کا داغ رہ گیا تھا

ہاں آج کھلی جو لوحِ محفوظ
تخلیق کا راز کھل گیا تھا

لونگ آئی لینڈ سے اسلام آباد تک

سحر گاہ ہر روز جب کوئی چڑیا

دریچے پہ مورین مورین کہتی ہوئی چہچہاتی

تو چڑھتے ہوئے دن کی بے رحم، بے درد، سنگین ڈھلوان اوپر

مجھے اپنے امریکی ڈَکٹُور کی سکٹری یاد آتی

اور اُس یاد کے ساتھ ہی آپریشن کے وہ سیکٹروں خستہ کُن مرحلے بھی

کہ جو اُس دیارِ غرائب میں ہر ہر قدم مجھ کو درپیش تھے

ہر اک دن غرض ایک کہسارِ رنج و محن تھا

مگر آج اللہ اکبر کی مانوس آواز نے جب جگایا

تو بڑھتے ہوئے چاند کی دودھیا چاندنی میرے سینہ پہ سوئی ہوئی

ننھی نورین پر پڑ رہی تھی

اور آنگن کا ہر ذرّہ ہر نقش خود میں مگن تھا

یہ اپنا وطن تھا

یہ اپنا وطن تھا

زینۂ چوب پر ایک لڑکی برہنہ بدن[1]

کچی چاندی کی صورت جھمکتا بدن

سچے سونے سے ڈھالی ہوئی مو بمو

اپنے پنجوں کے بل، زینۂ چوب پر
روشنی گویا چھنتی ہوئی

سہج چلتی ہوئی، دُخترِ برہمن

سوچ سے پاک یوں اس کا اجلا سا من

جیسے ملبوس سے وہ برہنہ بدن
ران پر ران کی ضرب پڑتی ہوئی کھن کھنن کھن کھنن
اور موجِ ہوا اس کے ہونٹوں کو چھو کر سمٹتی ہوئی
دور ہٹتی ہوئی

تا گزر جائے سارا یہ سامانِ تن

یہ سُبک آبشار، ایک لڑکی کا ننگا بدن

---

1 امریکی شاعر ایکس جے کینیڈی کی مشہور زمانہ نظم The Nude Descending The Stairs کا ترجمہ۔

ایسی نرمی سے آہستگی سے اُترتی ہے وہ
جیسے پوروں میں پھسلے کوئی ریشمی پیرہن
اور آخر میں پھر اس طرح سے ٹھہرتی ہے وہ سیم تن
اس کے اعضاء کی سب جنبشیں، لرزشیں
ایک جا ہو کے پھر اپنے پیکر میں ہو جاتی ہیں نغمہ زن
ایک دُختر برہنہ بدن

رفیقِ نا آشنا

یہ لڑکی جو اس کار کے ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی
اوپری اور اچٹتی نگاہوں سے شیشوں کی دیوار کے پار
اپنے مانوس رنگین ماحول کو تک رہی تھی
نجانے خیابانِ ہستی کے کس موڑ پر
اُس کا احساس جاگے اور اُس کو یہ معلوم ہو
کہ اُس سے بس اک سانس کے فاصلے پر
اک انسان بیٹھا ہے
جس کی نظر میں بڑی دُور تک
کھردری، پیچ در پیچ، کالی، اندھیری، سڑک ہے

نہ معلوم وُہ کون تھی

رئیس اِدارہ کی ستھری چمکتی ہوئی میز کے ایک کونے پہ دستِ تراشیدہ رکھ کر
جب اُس خانمِ ناشناسا نے آنکھوں سے چشمہ اُتارا
تو ایسا لگا جیسے کمرے میں کچھ روشنی بڑھ گئی ہو
متانت سے اس نے کوئی بات پوچھی
جواباً مُڑی مسکراتی ہوئی جانبِ در بڑھی
اور سماعت کٹوروں میں رس گھولتی
بصارت کے باریک شفاف پردوں پہ ٹوٹے ستارے کی مانند زرتار خط کھینچتی
پیش منظر کے بے معنی' بے رنگ پیڑوں میں گم ہوگئی
نہ معلوم وہ کون تھی

سقوطِ شادمانی

مسرت کے اُس لمحۂ بے کراں میں

کہ ہم دونوں لیٹے ہوئے گھاس پر نیلے آکاش کو دیکھتے تھے

تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے کہا تھا

خوشی شادمانی کی کتنی بڑی اور کتنی حسیں سلطنت میرے زیرِ نگیں ہے

یہ مخمل سا تو شک نما نرم سبزہ

ہوا کا یہ کیفِ خمار یں

چمکتی ہوئی دھوپ کے گرم پیوست بوسے

فلک کی فراخی

فضاؤں کا یہ مہربانہ رویّہ

اور ان سب سے بڑھ کر

تمہاری محبت کا سرشار و پُرشور احساس

خدایا مسرت کا یہ لمحۂ بے کراں مجھ کو پاگل نہ کردے

مگر آج جب ہم وہیں اپنے مانوس گوشے میں پنہاں

اُسی گھاس تختے پہ لیٹے ہوئے نیلے آکاش کو دیکھتے ہیں

تو محسوس ہوتا ہے جیسے

زمیں صرف کانٹے اُگاتی ہے

چمکتی ہوئی دھوپ میں تیر ہی تیر ہیں

آسماں ایک پتّھر کی سِل کی طرح سینے پر بوجھ ہے

ہواؤں سے دم گھٹ رہا ہے

خوشی شادمانی کی وہ سلطنت لُٹ چکی ہے

اور ہم دونوں دہلی سے بھاگے ہوئے دو مغل شاہزادے

کسی اجنبی غیر معروف بستی کی کہنہ سرائے میں

بے خواب کروٹ بدلتے

بس اس تاک میں ہیں

کہ کب آنکھ جھپکے

اور ہم اپنے ساتھی کے سینے میں خنجر اتاریں

لغزشِ دست[1]

تو فنکارِ اعظم ہے نقاشِ کُل ہے
ترے موقلم سامنے نقش تیری اطاعت پہ مجبور ہیں
تری فکر سے متصّل اُس کا اظہار ہے
تری سوچ کے صُلب میں اس کی تکمیل ہے
ترے دستِ قدرت نے جو خط بھی کھینچا وہ آخر ہوا
جو تصویر تو نے بنائی وہ کامل ہوئی
مگر کینوس پر کبھی کاسۂ رنگ جب لغزشِ دست سے تیرے گر کر الٹتا ہے
اور تیری تصویر کے نقش پھر سطحِ امکاں میں معدوم ہوتے ہیں
تو میں سوچتا ہوں
کہ اے قادرِ کُل تجھے اپنی لغزش پہ قدرت نہیں ہے

1 اپنے ایک حسین و جوان عزیز کی موت پر کہی گئی۔

○

قُربتیں مٹ جائیں گی اور دُوریاں رہ جائیں گی
راہِ اُلفت پر اَنا کی سُولیاں رہ جائیں گی

محو ہو جائیں گے سارے انگبیں کے ذائقے
ساغرِ فردا میں بیٹھی تلخیاں رہ جائیں گی

پیار سے اُٹھی ہوئی بانہیں گریں گی شرمسار
اُجڑے رستوں پر لٹکتی ٹہنیاں رہ جائیں گی

یہ مکاں جب منہدم ہو گا گھنی برسات میں
راستہ تکتی ہوئی دو کھڑکیاں رہ جائیں گی

بیٹھ جائے گی تری آواز تو دو دِن کے بعد
بین کرتی رات کی خاموشیاں رہ جائیں گی

مسخ ہو جائیں گے جذبوں کے دَرخشاں خدّ وخال
تیرے طاقِ ذہن پر پرچھائیاں رہ جائیں گی

ٹوٹ جائیں گے اَنا کے قدِ آدم آئنے
دُور تک اُن آئینوں کی کرچیاں رہ جائیں گی

کوئی صُورت اب نہ اُبھرے گی غمِ اظہار کی
میرے سینے میں گڑی یہ انگلیاں رہ جائیں گی

پی تو لوں گا آخری پیالی بھی اِس تلخاب کی
منہ میں پچھلے حادثوں کی پتّیاں رہ جائیں گی

پھر سفر درپیش ہے پرتَو کھُلے دریاؤں کا
ساحلوں پر دُور ہوتی بستیاں رہ جائیں گی

○

جھلسی ہوئی دھرتی پر سُکھ چین کی برکھا دے
جو پیار کی فصلوں کو بڑھوار کا سونا دے

اللہ کے بندوں میں ہے کوئی بھلا مانس
بھٹکے ہوئے راہی کو جو راستہ بتلا دے

بس ایک ہی صُورت ہے بستی کے سُدھرنے کی
ہر شخص کو پنچائت کرتوت کا بدلہ دے

آدرش کا وہ جگنو جو دُور چمکتا ہے
ان گہرے اندھیروں میں وہ اب بھی اُجالا دے

میں بند کئے آنکھیں بیٹھا ہوں خیالوں میں
پتّھر کوئی مارے تو شاید مجھے چونکا دے

کچھ آگے بڑھے پرتو اُلفت کی روایت بھی
جہلم کے حسینوں کو رَب علم بھی تھوڑا دے

○

تیری یاد کی ٹیسیں اُٹّھیں رہ رہ کر یُوں جانی، ہو
پوہ کی ٹھنڈی رات میں جیسے دُکھتی چوٹ پُرانی ہو

دل کی بات بتاؤں کس کو سمجھے کون پرائی پیڑ
من بپتا کا سانجھی بنانا چھاتی چیر دکھانی ہو

ہم پردیسی تیرے نگر میں آن کی آن ہی ٹھہریں گے
کل کی ہونی وہ ہی بوجھے جس کو گوٹھ بسانی ہو

تیرے روپ کا چندا چمکا ہر بستی ہر گاؤں میں
میرے پیار کی خُوشبو پھیلی بن بن رات کی رانی ہو

من تو ایسا الّھڑ بالک مانگے انگاروں کا کھیل
جیون وہ کٹھنائی کا رستہ، چاہے چال سیانی ہو

پیار تو وہ مورکھ کی ارتھی مرنے والا آپ اُٹھائے
پریت تو وہ چھاتی کی اگنی رو رو آپ بُجھانی ہو

پرؔتو اِس بستی کے پنکھی کتنے بھولے بھالے ہیں
ایسی بگیا پر منڈلائیں راکھی جس کی پٹھانی ہو

○

یہ چاہتوں کا کھیل بھی کتنا عجیب تھا
شہروں کے فصل پر بھی وہ دل کے قریب تھا

اِک سمت میں تھا رشتۂ اُلفت بگوش و دست
اور ایک سمت وہ دل و جاں کا رقیب تھا

ہر بات اُس کی برف کے پانی کی بوند تھی
ہر بول میرا آتشِ دل کا نقیب تھا

ہر لفظ تھا خلوص کا پیکر ڈھلا ہُوا
ہر جذبہ خانوادۂ غم کا نجیب تھا

وارفتگی بھی میری اسے تو قبول تھی
دیوانہ پن بھی میرا وہاں پر مجیب تھا

ہونٹوں کی آنچ پھر بھی بُنا گوش تک رہی
مَیں چومتا اُنہیں یہ نہ میرا نصیب تھا

○

ہمکتی چیختی چلّاتی زندگی دیکھیں
چلو سڑک پہ چلیں، چلتے آدمی دیکھیں

وہ رہنما ہیں کہ تفریق پر ہے جن کی معاش
ہم ایسے خواب میں بھی امن و آشتی دیکھیں

خُدا وہ دن نہ دکھائے یہ آخری دیوار
بنانے والوں کے ہاتھوں سے ٹوٹتی دیکھیں

کبھی وہ موسمِ گل آئے گا کہ آنگن میں
نہالِ علم کی کونپل بھی پھوٹتی دیکھیں

طلوعِ صبح کی اُمید ہے مجھے پھر بھی
اَب ایسے حال پہ یہ میری سادگی دیکھیں

○

محو ہونے پہ بھی ہر دور زماں رہتا ہے
زخم بھر جاتے ہیں زخموں کا نشاں رہتا ہے

خواب بسنے نہیں پاتے کہ بکھر جاتے ہیں
ایک سیلاب سا آنکھوں میں رواں رہتا ہے

جابرِ وقت زباں بند بھی کر دے میری
پھر بھی پہلو میں کوئی نعرۂ زناں رہتا ہے

ایک صورت کہ نظر آتی ہے دیواروں پر
ایک چہرہ کہ خلا میں نگراں رہتا ہے

زندگی اپنا نشاں چھوڑ گئی جاتے جاتے
اُجڑے میدان میں چولھوں کا دھنواں رہتا ہے

ایک میں ہی نہیں بیگانۂ احوالِ جہاں
تو بھی بیگانۂ احوالِ جہاں رہتا ہے

عین ممکن ہے کوئی تیرا پتا بتلا دے
اس لیے نام ترا وردِ زباں رہتا ہے

اُس سے ملنے کی کوئی راہ بھی نکلے کیسے
ہم کہاں رہتے ہیں پرتو وہ کہاں رہتا ہے

○

گرچہ ہرگام نیا خطرۂ جاں شہر میں ہے
پھر بھی ہم خوش ہیں کہ وہ جان جہاں شہر میں ہے

ایسا لگتا ہے کہ ہر گھر میں سُلگتی ہے اک آگ
چار سو پھیلا ہوا جس کا دھواں شہر میں ہے

خواہش خواب سراسیمہ ہے کوچے کوچے
دردِ دل آہ زناں نعرہ کناں شہر میں ہے

بھاگا جاتا ہے ہر اک مضطرب و خوف زدہ
گویا عفریت ہے کوئی کہ نہاں شہر میں ہے

اب تو ماں بھی نہیں پہچانتی بچّے اپنے
حشر اٹھا ہے قیامت کا سماں شہر میں ہے

لٹ گئی نقدِ سکوں کب کی دیارِ دل سے
اب تو بے چینی کا سکّہ ہی رواں شہر میں ہے

دل گنوا بیٹھے تھے پہلے ہی جناب پرتوؔ
اور کچھ ٹھہرے تو جاں کا بھی زیاں شہر میں ہے

○

اک جبر کہ رستے سے گزرنے نہیں دیتا
مرضی سے کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتا

ہم زخمیٔ پیکار ہوئے ہیں ایسے
اب زخمۂ جاں آہ بھی بھرنے نہیں دیتا

اک سیلِ تحرّک ہے کہ طاری ہے جہاں پر
اک نشّہ ہستی ہے کہ مرنے نہیں دیتا

وابستہ ہوں میں جذبِ سماوات میں ایسا
مجھ کو مری خواہش پہ بکھرنے نہیں دیتا

ہے مائلِ افلاک مرا مرکبِ رفتار
وہ ارضِ مقدس پہ اترنے نہیں دیتا

اب راغبِ پرواز ہے مجنوں کہ سرِ دست
پندارِ جنوں پاؤں بھی دھرنے نہیں دیتا

ہر موجۂ امکاں میں فشار ایسا ہے پرتو
جو سطحِ سمندر سے ابھرنے نہیں دیتا

○

ختم ہونے نہیں پاتی ہے مسافت میری
کوئی بتلائے تو کس سمت ہے جنّت میری

کوئی مُرشد نہیں آیا جو اُجالا کرتا
کھو گئی ٹھوکریں کھا کھا کے ارادت میری

اب جو خورشید بھی اُبھرے تو اندھیرا ہو گا
رات نے ایسی اجاڑی ہے بصارت میری

میرے آنگن میں بھی پھولے نہ مرے خواب کبھی
میرے دامن پہ بھی برسی نہ بشارت میری

میرا اپنا کوئی بیٹا کِسی لائق نہ ہُوا
مِل گئی غیر کو افسوس وراثت میری

میرے سجدوں کو بھی فردوس کا رستہ نہ ملا
زندگی سے بھی رہی دُور عبادت میری

تُو نے سائے میں بٹھایا یہ کرم ہے تیرا
مَیں تری زُلف سنواروں یہ سعادت میری

تو نہیں ہو تو فقط واہمہ ہے میرا وجود
ہے ترے نام سے وابستہ حقیقت میری

منصفی چاہوں بھی میں آج تو کس سے چاہوں
میری تقدیر نے چھوڑی ہے وکالت میری

شاخِ گندم کے لئے حشر بپا ہے ایسا
کروٹیں لیتی ہے قدموں تلے جنت میری

یوں سرِ راہ ہُوا ہُوں مَیں برہنہ پرتو
اِک صدی چاہیے مٹنے کو خجالت میری

○

اپنی ڈیوڑھی جھاڑ میاں تو اپنا آپ سنوار، میاں
اپنے ساتھ ہی لے جائے گا ہر اک اپنا بار میاں

دل کی کھڑکی کھلتی ہے تو جگمگ جگمگ کرتے ہیں
کثرت کے اِس شیش محل میں وحدت کے آثار میاں

رہ رہ کر اس بوجھ تلے مَیں کب سے پستا جاتا ہوں
چھاتی سے کب میری اُٹھے گا جیون کا انبار میاں

سینہ تو گھائل ہونا تھا اور زخم بھی دل میں لگنے تھے
چاہت کے اِس خنجر کی جب اُلٹی ہو گئی دھار میاں

چھاتی اندر آن براجے کیسے عُریانی کے دیو
مجھ سے اپنا حق مانگے پیراہن کا ہر تار میاں

تپتے شک ویرانوں گھومیں پیاسی سوچیں ننگے پاؤں
نا اس رستے چھاؤں کہیں نا اس بستی دیوار میاں

مجبوری کا اس سے بڑھ کر کیا طعنہ ہو گا پرتو
ہنس ہنس کر جب اپنے پرائے مجھ کو کہیں مختار میاں

○

اُلفت کر، کیا پاؤ گے مختار علی خاں
روؤ گے پچھتاؤ گے مختار علی خاں

پہلے دوراہے پر مُڑ جاتے ہیں ساتھی
کس سے ساتھ نبھاؤ گے مختار علی خاں

ہستی کی مجبوری پوچھے گی جب نام
اس کو کیا بتلاؤ گے مختار علی خاں

شمع رخوں کی اُلفت میں بس لحظہ لحظہ
اپنی جان جلاؤ گے مختار علی خاں

دل کے ضدی بالک کو آئینہ دکھلا
کب تک یوں بہلاؤ گے مختار علی خاں

ماں نے گود میں لے کر کیا یہ بھی سوچا تھا
چھاؤں میں جل جاؤ گے مختار علی خاں

سوتے میں جیتے ہو، آنکھیں لاکھ کھلی ہوں
سوتے میں مر جاؤ گے مختار علی خاں

○

ذات کے غم سے کِسی صُورت بھی چھٹکارا نہ تھا
بند تھے ایسے مکاں میں جس کا دروازہ نہ تھا

تھیں بگولوں کی فصلیں دُور تک پھیلی ہوئی
چلچلاتی دھوپ تھی، قدموں تلے سایہ نہ تھا

راستے میں کچھ ببولیں بھی نظر آئیں مگر
سب برہنہ جسم، شاخوں پر کوئی پتّا نہ تھا

ریت کے ٹیلوں پہ چھوٹی ٹھِکریاں بھی تھیں مگر
کھیلنے والا کوئی بچّہ نظر آتا نہ تھا

کرب کی دیوار اُٹھتی جا رہی تھی میرے گِرد
جسم کے دوزخ سے باہر کا کوئی رستہ نہ تھا

پیاس کا صحرا تھا تاحدِّ نظر پھیلا ہُوا
ہونٹ نم کرنے کو اِک قطرہ کہیں ملتا نہ تھا

رُوح کی بھٹّی سے پرتو آ رہی تھی ایسی آنچ
جسم رہ رہ کر سلگتا تھا مگر جلتا نہ تھا

○

پربت چوٹی دھاویں گے، کوئی جنگل کٹیا چھاویں گے
برگد نیچے بیٹھیں گے اور رب سے دھیان لگاویں گے

جگ کی ریتیں روکیں گی نا کوئی سیانا ٹوکے گا
اپنی مرضی روویں گے ہم اپنی مرضی گاویں گے

لابھ للک میں حرص و ہوس میں کالے بال سفید ہوئے
بھور بھئی اب اجیالے میں شیام سے آس لگاویں گے

جگ کے رشتے ناتوں نے تو جیون گھر ڈھنڈار کیا
توڑ کے سارے جیون بندھن پیتم گوٹھ بساویں گے

ہنستی کِھلتی جیون کیاری لاگ لپٹ سے مرجھائی
تیرے پیار کی کُھرپی لے کر سارا کھیت نلاویں گے

سوچ کی ڈفلی پر ہم پاگل ناچے، رستہ بھول گئے
پیت کی اَب مِردنگ بجا کر بھولے رستے پاویں گے

بھائی بہن کا خون پیا اور لوگو ہم بلوان ہوئے
یہ بَل تب ہی نکلیں گے جب اپنا ماس کِھلاویں گے

رُوپ کی جھلمِل نے تو ہم کو اندھیارے میں چھوڑ دیا
آنکھیں موند کے اَب ہم پرؔتو من کی جوت جگاویں گے

○

طلب کی دلگیر غنچگی کو بس ایک شب زندگی ملی ہے
سحر کو کیفِ شگفتگی میں سکوں کی وا ماندگی ملی ہے

کبھی نقابوں کی بدلیوں سے نتھر نتھر کے ہے دھوپ برسی
کبھی شلوکوں کی اوٹ سے پھُوٹتی ہوئی چاندنی ملی ہے

ہماری تنہائیوں میں بھی اِک لطیف سی نغمگی بسی تھی
کہ بامِ شب کے ہر اک دریچے میں گونجتی خامُشی ملی ہے

خرد کا ایواں بھی اِک ہیولا، جنوں کا صحرا بھی اِک بگولا
وہاں پہ بے چارگی ملی تھی، یہاں پہ آشفتگی ملی ہے

کِسی کے ساغر میں زہر گھولا، کسی کو دارِ جفا پہ تولا
ترے جہاں کی گھٹی فضا میں حیات کی لَو بجھی ملی ہے

کِسی حسینہ کی ٹوٹی گاگر کے ٹھیکروں کی طرح ہیں ویراں
وہ لب کہ جن پر کبھی بہاروں کی پُرسکوں تازگی ملی ہے

حیات کی سیج پر مجھے بھی حسین پھولوں کی آرزو تھی
مگر سمے کی ہر ایک سلوٹ میں شوق کی بے بسی ملی ہے

کبھی جو ماضی کے پیرہن میَں نے یاد کی الگنی پہ ڈالے
تو ملگجی ریشمی تہوں میں گُلوں کی خوشبو بسی ملی ہے

سیاہ راتوں کی جدولوں پر نبوکِ مژگاں لکھا ہے میَں نے
وہ اِک فسانہ حقیقتوں کو بھی جس سے تابندگی ملی ہے

خلوصِ دل بھی عجیب شے ہے الم کی تاریک وادیوں میں
ہمیں تو پرتو اسی سہارے یہ مشعل آگہی ملی ہے

○

بیتے سمے کی ٹہنی پکڑے جھول رہے ہیں گہرے سائے
پورب پچھّم کاوے کاٹے من کا پنچھی بیٹھ نہ جائے

اُڑتے سمے کے پنکھ سے جوگی‘ بُجھ جاتا ہے پیار کا دیپک
بوجھ کی ٹھنڈی بھوبل میں یہ پیت اگن بھی کجلا جائے

چار گھڑی کا جیون اپنا اِس نگری میں یوں ہے جیسے
گہری نیند سے چونکے بالک کروٹ بدلے اور سو جائے

رات اندھیری بھرا ساگر‘ بوجھ کی کچی پتواریں ہیں
من کی نیّا ہائے کھویّا‘ ہولے ہولے ڈوبتی جائے

جیون کی اس پگڈنڈی پر سنّاٹے نے بین بجائی
اندھیارے کی ناگن جھومے تان کو اپنے پھَن پہ اُٹھائے

پچھلی جھڑی میں ایک گھڑی کو بجھ نہ سکا تھا من کا الاؤ
آج بھلا یہ بوندا باندی من کی چِتا کو کیسے بُجھائے

پھولوں کی مسکان سے لے کر چاند کی شیتل کِرنوں تک
رنگ کے ماتے، رُوپ کے رسیا، سب بیٹھے ہیں آس لگائے

تال کنارے آج بھی پرؔتو سوچ رہے ہیں پنکھ پکھیرو
جیون کی یہ ڈوبتی تانیں، کون اُٹھائے کون اُٹھائے

○

ماتھے ماتھے چندا دیکھے، ٹھوڑی ٹھوڑی تارے
رُوپ کی جھلمل مایا تیرے تیور تیکھے، رُوپ نیارے

سانس کی ایسی نرم چھُری سے کٹتی ہے یہ جیون ڈوری
جینے والے کتنے بھولے، پھرتے ہیں چھاتی کو ابھارے

سُونی سُونی آنکھوں پر کیوں روتے ہو اے رونے والو
اُس اندھے کے بھاگ کو روؤ، چھوڑ جسے اٹکل بھی سدھارے

کِس کے پاؤں کی چاپ بسی ہے رات کے گہرے سایوں میں
جلتے دیئے کی لَو میں رچے ہیں کس کی سجل آنکھوں کے اشارے

چاند کی پہچل ڈوب گئی جب رات کے سُونے آنگن میں
بیتے سمے کا دیپک لے کر سوچ چلی پیتم کے دوارے

جیون تو ہے پینٹھ سماں ٹک مول کرو اور بھاؤ چکاؤ
منڈی منڈی پھرنے والے کب پلٹے ہیں یہ بنجارے

اپنی جگہ پر گُم سُم ہوں میَں آگے بڑھوں یا پیچھے جاؤں
سوچ کی وہ زہریلی ناگن، ہر پگڈنڈی پر پھنکارے

آلھا اودل ختم ہوئی، چوپال پہ چھایا سنّاٹا
یاد کا اِک دُکھیارا جھینگر رہ رہ کر ہر آن پُکارے

شہر کے گنُیوں کی منڈلی میں، جانچ پرکھ کے ڈھنگ نرالے
گاؤں گوٹھ کے رہنے والے پرؔتو کیا جانیں بیچارے

○

دل میں کھٹکے ہے غمِ یار، خدایا چہ کنم
یہ محبت ہوئی آزار، خُدایا چہ کنم

اُس ستم کیش سے بڑھتی ہے محبت جتنی
اور ہوتا ہے وہ بیزار، خُدایا چہ کنم

ہر بُنِ مُو سے اُبلتی ہوئی صہبائے شباب
جسم کِھلتا ہوا گلزار، خدایا چہ کنم

دل کو آدابِ وضعداریٔ غم سے نفرت
اور معشوق طرحدار، خُدایا چہ کنم

آرزو کو نہیں اب تابِ جمالِ خُوباں
طفلِ دل کو طلبِ یار، خُدایا چہ کنم

کوئی اُٹھتا ہے تو محفل کو جلو میں لے کر
کوئی بے یار و مددگار، خدایا چہ کنم

جادۂ خواب پہ تقدیر رواں ہے اپنی
فتنۂ حسن ہے بیدار، خُدایا چہ کنم

حسن خو کردہ تسلیم و نیازِ طالب
عشق دیوانۂ پندار خُدایا چہ کنم

مجھ کو مجبور بنا کر یہ ستم اور کیا
نام رکھّا مِرا مختار، خُدایا چہ کنم

ہر نفس صاحبِ آلامِ مسلسل، پرتو
اس پہ یہ شورشِ افکار، خُدایا چہ کنم

○

اُس سروِ سہی کو خود اس دل میں بٹھا کر کے
اک باغ لگایا تھا ہم نے بھی وفا کر کے

اک آہ نکلتی ہے جب یاد وہ آتا ہے
ظالم وہ کہاں بیٹھا، ہے ہم کو بھلا کر کے

جلتا ہوں سُلگتا ہوں دکھلاؤں کسے جا کر
وہ آگ جو سینے میں رکھّی ہے دبا کر کے

بے درد کے غم سہ کر، مظلومِ وفا رہ کر
دکھلا دیا دنیا کو ہم نے بھی وفا کر کے

وہ سچّی مسرّت ہے ملتی ہے جو انساں کو
فرض اپنا ادا کر کے بوجھ اپنا اُٹھا کر کے

یہ شعر کہے میں نے اک دوست کی بیتوں پر
لازم ہے معافی بھی آداب بجا کر کے

خاموش بھی ہو پرؔتو بے حال کیا تو نے
اک قصۂ پارینہ سو بار سنا کر کے

○

اُس کی خوشبو سے بسا قریۂ جاں ہوئے گا
پھر بھی وہ پھول کہ نظروں سے نہاں ہوئے گا

میرے دامن سے جو لپٹا ہے یہ لمحہ اِس دم
کل کی بے سمت مسافت میں کہاں ہوئے گا

کیسے کچھ درد چھپا رکھّے ہیں میں نے دل میں
یہ دفینہ بھلا کب کس پہ عیاں ہوئے گا

تنگ جانی مری یہ رنگ دکھائے گی کبھی
رشتۂ جاں بھی طبیعت پہ گراں ہوئے گا

نان کی فکر بھی ہوئے گی غمِ یار کے ساتھ
زندگی ہے تو یونہی کارِ جہاں ہوئے گا

نقدِ جاں ہم نے گرہ میں بھی چھپا کر دیکھی
کیا خبر تھی ہمیں اِس پر بھی زیاں ہوئے گا

پہلے دیوار گرے گی کہ دریچے اُس کے
منہدم کیسے یہ مٹّی کا مکاں ہوئے گا

وہ مرے سامنے ہوئے گا حقیقت بن کر
پھر یقیں ہوئے گا پرتوٓ نہ گماں ہوئے گا

○

جنوں کبھی رہِ پُرخار سے نہیں رکتا
کہ شوقِ منزلِ حق، دار سے نہیں رکتا

کوئی بتائے مرے عہد کے طبیبوں کو
فسادِ جسم کا گفتار سے نہیں رکتا

زمانہ دیکھ رہا ہے ہجومِ سنگ زناں
تفنگ و توپ کی یلغار سے نہیں رکتا

رگِ گلو میں ہو پیوست دشنۂ اعدا
تو خوں تسلّیِ دلدار سے نہیں رکتا

یہ خفتگانِ فلاکت کا قافلہ ہی سہی
تمہاری دولتِ بیدار سے نہیں رکتا

ستم گری کا نتیجہ الگ حقیقت ہے
کسی کی خواہش بسیار سے نہیں رکتا

ہزار بند بھی باندھے یہ فوجِ حیلہ گراں
یہ سیل اب کسی دیوار سے نہیں رکتا

محاذ سیکڑوں ہوتے ہیں جنگ میں پر تو
مقابلہ فقط اک ہار سے نہیں رکتا

نعت

یہ توفیقِ الٰہی بھی ہے احساں بھی اب وجد کا
کہ مجھ سا ایک عاصی نام لیتا ہے محمدؐ کا

محبت فرش ہے اُس کا یہ دربارِ رسالت ہے
یہاں توحید مسند ہے، یقیں تکیہ ہے مسند کا

یہی معراجِ انساں ہے بدن خاکِ مدینہ ہو
وہ گنبد ہو ٹھکانا طائرِ روح مقیّد کا

نہ جانے اشتراکِ حسنِ معنی کس قدر ہو گا
خدا ہی جانتا ہے راز اُس اسمِ مشدّد کا

رُخِ پاکِ محمدؐ ہی بالآخر منتخب ٹھہرا
نظر حیراں ہے کیا مصدر ہے اُس نورِ مجرّد کا

رسائی ان کے روضے تک عنایت ہے مشیّت کی
سعادت ہے بصارت کی نظارہ ان کے گنبد کا

محبت آپ کی روزِ جزا ضامن شفاعت کی
غلامی آپ کے در کی دیا ہے میرے مرقد کا

مجھے بھی کاشفِ اسرارِ حق وہ اسم بتلا دے
کہ کھُل جائے مرے سینے کے اندر قفل ابجد کا

قیامت میں جو پرسش ہو کہ پرتو کس کا چاکر ہے
پکاروں جذبِ دل سے میں محمدؐ کا محمدؐ کا

نعت

بشر اور کتنا گرامی ہوا
خداوند سے جا کلامی ہوا

رسالت کے رتبے کو گر سوچیے
بھلا کون کس کا پیامی ہوا

یہ اسم محمدؐ کی تاثیر ہے
کہ ہر نام اس سے تمامی ہوا

سعادت بھی کیسی بشر کو ملی
شرف آدمی کا دوامی ہوا

وہ اقدار میں آ گیا انقلاب
کہ شاہوں کا اسلوب عامی ہوا

وسیلہ رہائی کا روزِ جزا
بس اک اُن کا بندِ غلامی ہوا

ثناہی سے ان کی گرامی ہیں سب
وہ قدسیؔ ہوا یا کہ جامیؔ ہوا

نعت

مرے خدا مرا اتنا تو مرتبہ کر دے
مجھے بھی خادمِ خدّامِ مصطفےٰ کر دے

تری خدائی سے کچھ بھی نہیں مجھے مطلوب
جو اذنِ نعتِ محمدؐ مجھے عطا کر دے

مرے دہن پہ ملائک دیا کریں بوسے
زباں کو مدحتِ احمدؐ سے آشنا کر دے

ثنائے خاتمِ مرسل مرا وظیفہ ہو
درودِ رحمت عالمؐ مری دعا کر دے

سعادتِ بشری کے وہ سب دریچےؔ جو
نبیؐ کے کوچے میں کھلتے ہیں مجھ پہ وا کر دے

زمیں کی سمت ہے مائل اگر کثافتِ جسم
تو بارِ جاں کو پھر اس جسم سے جدا کر دے

مرا سفینہ بھی ساحل سے آ لگے جو خدا
رسولِ پاکؐ کی اُلفت کو ناخدا کر دے

نعت

بحرِ مردار سے اٹھتا نہیں کوئی بادل
مزرعِ فکر کہ برسوں سے پڑی ہے چٹیل

ایک سکتہ سا مسلّط ہے دیارِ دل پر
کوئی آواز نہ آہٹ نہ کسی کی پیچل[1]

حیف، قطرہ بھی نہ آیا سرِ مژگاں کوئی
ورنہ اشکوں سے بھری رہتی تھی اپنی چھاگل

دل دھڑکتا ہے تو گھڑیال کی صورت، جس میں
نہ تڑپ کوئی نہ بے تابی نہ کوئی ہلچل

کشتِ جاں کو بڑی مدت ہوئی سیراب ہوئے
ایک عرصہ ہوا اس میں نہیں پھوٹی کونپل

---

1 چلنے پر پاؤں کی آہٹ۔ روہیلکھنڈ میں عام بول چال میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ایسا لگتا ہے یہ دنیا کوئی ویرانہ ہے
ریگ افشاں ہوں جہاں میں تنِ تنہا پاگل

ہوشیاری، کہ مرے ہوش گنوائے جس نے
عقلمندی، کہ مری جس نے بھلائی اٹکل

میری کوشش ہی مرے واسطے اک دام ہوئی
میرے اشغال بنے میرے لیے اک مَقتَل

ایسی حالت ہے کہ پتّھر بھی نہیں میرا وجود
میں دعا کرتا ہوں اللہ سے بس یہ ہر پل

مجھ کو سیمابیٔ دل پھر سے عنایت کر دے
خاطرِ ساعتِ امروز کو کر دے بے کل

شمعِ افسردہ بھڑک اٹھے الاؤ بن کر
شعلہ افشاں ہو دلِ مردہ کی ٹھنڈی بھوبل

پھر مجھے روضۂ اطہر کی زیارت ہو جائے
پھر مجھے کوچۂ فردوسِ محمدؐ لے چل

جسم سرشارِ سعادت ہو، ترانے گائے
روح فرطِ طرب و شوق میں گائے منگل

وقت خوش حال ہو پیراہنِ رنگیں پہنے
ہر گھڑی عید ہو ہر لمحہ ربیع الاوّل

چشمِ بے نور پہ روشن ہوں حقائق، گویا
ہر قدم کوئی جلا دیتا ہو بڑھ کر مشعل

گنبدِ سبز سے وہ نور کی دھاریں پھوٹیں
قلبِ سنگیں کو پلک بھر میں جو کر دیں صیقل [2]

2 ناتمام

دوہے

گیان دھیان

مانس

میری سمجھ میں مانس کی اے سیانو بات نہ آئے
اپنے آپ کو دھوکے دیوے، پھرِ مورکھ پچھتائے

بوڑھے مارے، ناری موسے، بچّوں کو ہتیائے
نام رکھاوے دین محمدؐ، دیکھو تو انیائے

ہر ہر سانس میں جیون ڈوری چھوٹی ہوتی جائے
مانس کتنا بھولا جناور، گل کی آس لگائے

سانپ کا منکا مل جائے ہے، بستی نہیں تو گاؤں
میں مانس کا کاٹا لوگو، میں کِس وید دکھاؤں

کتّا بیری کُتّے کا پَر اپنایت دکھلائے
مانس ایسا کتّا لوگو مانس ہی کو کھائے

چیلیں، کوّے نوچے ہیں جب ڈھور کوئی مر جائے
مانس ایسا گدھ ہے لوگو! جیتے جی کو کھائے

نالی میں جو لوٹے ہے اور کوڑھ کو اپنے چاٹے
مانس لوگو وہ کتّا ہے، پالن ہار کو کاٹے

اکلاپے کی پیر جو سمجھے دکھ میں جی بہلائے
میری گیتا میں تو لوگو دیوتا وہ کہلائے

بے بس کو جو دھیرج دے اور نربل کا ہو سہائے
اُس مانس کے چرنوں اوپر دیتے سیس نِوائے

جیون

مٹی کا اک ڈھیر ہے، ٹوٹا سانس کا جب سمبندھ
کوڑا کرکٹ رہ گیا لوگو، نکلی پھول سگندھ

مٹی تیرا دیس ہے پگلے، مٹی تیرا بھاگ
پانی بن کر چاہے جی لے چاہے بن کر آگ

ٹوٹ الاؤ سے تو نکلی لوگو اک چنگاری
بھاگ میں کیا لکھا ہے اس کے کیا جانے بیچاری

ساگر سے جب کوئی ابھاگن بوند الگ ہو جائے
سورج تاپے، بھاپ بنے، پھر برسے، تب مِل پائے

اچھلیں کودیں، لانگھ نہ پائیں مجبوری کا ہالا
پرتو تیری میری رسّی پکڑے کون گوالا

اپنے آپ اتارے بابو اپنے آپ بٹھائے
ریل مسافر ٹُک ٹُک دیکھیں کوئی بوجھ نہ پائے

ریل کا اندھا بابو لوگو یگ یگ سَو اندھیارے
ٹھَور ٹھکانا دیکھے ناہیں، رستے بیچ اتارے

مال پرایا کھا کے دھرتی آدھا نا لوٹائے
ہیرے موتی بوئے اُس میں تب گل بوٹے پائے

دو بیسی تو سوتے بیتی، تیجی بیسی جاگے
اب اس ڈر سے نیند نہ آئے موت کھڑی ہے آگے

ایک اٹھے اوپر کو لوگو دوجا نیچے جائے
جیون ایک رہٹ کا چکّر مَت میری چکرائے

جیون رنگ گنو گے کیسے ان کا انت نہ آد
بوٹا، پتّی، پھل، پھلواری، مٹّی، پانی، کھاد

دونوں مٹّھی میچ کے روکوں پھر بھی نہ کچھ بن پائے
جیون کی یہ چکنی ڈوری ہاتھوں نکسی جائے

ڈوبنے لاگا سورج لوگو، لمبی ہوئی پرچھائیں
دن کو جن سے تارے دیکھے وہ آنکھیں گدلائیں

جیون اک بلوان کی لاٹھی ٹھاکر کا انیائے
نربل کی یہ چیخ ہے پرتو بے بس کی یہ ہائے

پیت بھاگ

گھاٹا ٹوٹا بھاگ ہمارا، جھوٹی لابھ کی آس
کیسا وہ بیوپار سکھی ری من ہو جس کی راس

پکّے باٹوں بیچا ہم نے کچّے باٹوں پایا
جیون کے بیوپار میں ہم نے اپنا آپ گنوایا

نیل گگن کا تارا تھا تو منڈی ملا نا ہاٹ
میں دھوبی کا کتّا لوگو بھول گیا گھر گھاٹ

گیان استھان

اس کو دیکھو دادا جس کے حافظ رحمت خان[1]
لوگوں سے وہ کہتا پھرے کیا سیّد شیخ پٹھان

خان، جلاہے، پنڈت، بامن، کُنجڑے، نائی، چمار
پریم کا کُنڈل اتنا بڑا ہے گھر جائے سنسار

سیّد، مرزا، خان، جلاہے، مفلس اور امیر
خالی ہاتھوں آئیں پرؔتو خالی جائیں اخیر

سب سے اونچا گیانی ہے وہ سب سے بڑا ودھوان
جس کے پاس سُکھی ہو ناری بال چڑھیں پروان

برسوں گھومے جنگل جنگل تب اس بھید کو پایا
اپنے کسَب کا پھل ہے لوگو گیان ہے نا کچھ مایا

1 ہندوستان میں روہلکھنڈ کے نام کی پٹھانوں کی ریاست کے بانی جو 21 اپریل 1774ء کو Warren Hastings کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

ایسا کون جتن ہے جس کا کرنا اکارت جائے
پانی ڈالو مٹّی پر تو مٹّی بھی سُندھیائے

ایک ذرا بلدان کرے تو چین سبھوں کو ہوئے
جاگے ہے اک رکھوالا تو سُکھ سے بستی سوئے

من اندر ہو کھوٹ بھری تو پانی بھی پتھرائے
سچّے پیار کا ننّھا دیپک پَربت کو پگھلائے

اپنے داؤں پہ چوکس رہنا سب سے بڑی اچّھائی
جیون کی رن بھومی اندر بہن ہے نا کوئی بھائی

تن شدّھی اشنان ہے پرؔتو دھن شدّھی ہے دان
منَ شدّھی پر سب سے کٹھن ہے تجنے پڑتے پران

دو بازو

یوں تو اس پھلواری اندر ہر ہر ڈال سُہائے
پھر بھی پرؔتو سچ مانو تو دو ہی بازو بھائے

ایک تو وہ جو دیس کی کارَن اٹّھے اور کٹ جائے
دوجا وہ جو میّت کے سر کا سرہانا بن جائے

دیس دکھ

کوئی بنا پنجابی لوگو کوئی بنا پختون
دیس کی پربت جیسی ایکتا بک گئی سب پرچون

لاش مری دفنائی گئی نا وہ پہنچی شمشان
میں نے کیا کس بات کی کارن لوگو یہ بلدان

ماتا ننگے سر گھومے ہے بہن پھرے بن چولی
پوتوں ہاتھ بھری پچکاری گلیوں کھیلیں ہولی

'گُنڈ' بھنور میں تو اے پربھو چلتی رہی یہ نیّا
پتّن پر جب آن لگی تو ڈوبی ہائے کھوّیا

مارے جاتے 'بھینٹ چڑھاتے' پھر کیوں ایسے ہوتے
آزادی کی مایا مل گئی ہم کو سوتے سوتے

آزادی کا روپ بتائے کیسے کیسے بھاؤ
پرجا کھائے سوکھے ٹکڑے راجہ مرغ پلاؤ

ڈھلوان

کس نے یہ پتھر لڑھکایا، کون گھڑی کس آن
اپنے من سے بیٹھا بوجھوں میں مورکھ نادان

میری چال میں کس کی مرضی کس پاگل کا زور
پیچھے بیٹھا دھکیائے جو کون ہے وہ بلوان

کب یہ پتھر ٹوٹ کے بکھرے کب ٹھہرے یہ چال
کب تھک جائیں پورک پرتو مٹک جائے ڈھلوان

پیت کچہری

روپ ونجارے سودا کر کے مال نہ جب اٹھوائیں
پیت کے گاہک یہ ٹنٹا کس پنچایت لے جائیں

جی چاہے ہم پیت کے مارے پنچایت بلوائیں
پنچ کو جھوٹے پیار کے گھاؤ چھاتی چیر دکھائیں

پیتم تم نے آ ملنے کی عرجی جو نامانی
پیت کچہری میں پھر جا کر کروں گی میں نگرانی

واری

واری اُس لکڑی پر جس نے بگڑے ہوئے سَدھائے
واری اُس لکڑی پر جس نے ڈاکو چور بَھگائے

واری اس لکڑی پر جس نے ڈوبے ہوئے ترائے
واری اس لکڑی پر لوگو نیّا پار لگائے

واری اس لکڑی پر جس نے بالک شبد سِکھائے
واری اس لکڑی پر جو اندھوں کو راہ دکھائے

واری اس لکڑی پہ جو خود اپنی جان جَلائے
لیکن اپنی باس سے ساری بستی کو مہکائے

واری اس لکڑی پہ گھر گھر چولھے آگ جلائے
واری اس لکڑی پر بوڑھی ماتا کو جو چلائے

واری اس لکڑی پہ جس کو ماتھے کوئی لگائے
واری اس لکڑی پہ جس سے روگی کو سُکھ آئے

واری اس لکڑی پہ جس کی اَبلا چھال چَبائے
واری اس لکڑی پہ جس پر گوری بیٹھ نہائے

سُکھ کا ایک بچھونا

میرے دیس کی مٹّی اندر چمپا پھول کی باس
میرے دیس کی دھرتی اوپر جُھکتا ہے آکاس

ایسی بانکی کٹیلی پرتو میرے دیس کی نار
روہیلوں کا خنجر جیسے مغلوں کی تلوار

میرے دیس کی ندیوں میں بہتی ہے ایسی کویتا
گاؤں کی الھڑ مٹیاروں نے پریم اکھاڑا جیتا

میرے دیس کے پانی اندر ایسا پریم اُبال
ہر ناری ہے سُہنی اس کی، ہر مانس مہینوال

میرے دیس کے مکھڑوں اوپر برسے ایسا روپ
بھور بھئے کا سورج جیسے سانجھ سمے کی دھوپ

ہر بالک ہے وِکرم اس کا ہر اَبلا ہے رانی
گنگا جل سے میٹھا لوگو میرے دیس کا پانی

دیکھو میرے دیس کے بانکے کیسے روپ پجاری
کان دھرے پھولوں کا گُچھّا، کاندھے تیز کٹاری

آن مان

اپنے کنوئیں سے پانی پئیں ہم اپنے گھاٹ نہائیں
اپنا جھوٹا دوجے کو دیں، نا دوجے کا کھائیں

وہ دن میں نا دیکھوں، اُس دن مولا مجھے اٹھا لے
میرے گھر کے کتّے کو ہمسایہ روٹی ڈالے

کیسا میں رکھوالا سجنو! کیسا میرا پالن
گائے ہماری چرنے جائے، ہمسائے کے آنگن

ماتا ناتا

مرنے پر بھی ٹوٹ نہ پائے اُس کا ایسا ناتا
دھرتی اوپر سب سے اونچی پرتو اپنی ماتا

ماتا پیار کا ساگر پرتو ماتا جوت منار
ماتا سُکھ کی پھلواری ہے ماتا جیو سنوار

ماتا سکھ کی نیند ہے پرتو ماتا چین کی چھاؤں
دھرتی اوپر ایشور ہے وہ ماتا جس کا ناؤں

پیار اور آشا کا یہ ناتا ایشور کو بھی بھائے
چولھے پاس بٹھا کر بالک، ماتا آگ جلائے

دو ہی رنگ میں پہنچے ہم تک ایشور کی ہُنکار
ماتا کی چمکار سکھی یا بالک کی کِلکار

روپ رنگ

جوبن مایا

دو سیبوں سے جھک جاتی ہے پرؔتو پیڑ کی ڈالی
روپ کی اتنی مایا گوری تو نے کیسے سنبھالی

من کا بالک گھبراوے ہے کیسے ہاتھ بڑھائے
مکھن کے پیڑے پر بیٹھا بھونرا موج اڑائے

اتنی سی کرتی روپ نگر کو کیسے بتاؤ ڈھانکے
جوبن مورکھ ایک نہ مانے کھڑکی کھڑکی جھانکے

آم کا لوگو پال اٹھا ہے بستی مہکی جائے
یا اُس گوری کا جوبن ہے راتوں کو گدرائے

آم بڑے دیکھے تھے لیکن ایسی کہاں مہکار
کون سی بگیا کے ہیں گوری پوچھے اک سنسار

تیرا جوبن دیکھ کے گوری مندر اور سُہائے
راج نے چِٹے گنبد اوپر کالے کلَس لگائے

گوری تیرا جوبن من میں ایسی جوت جگائے
پھول کنول پہ تتلی بیٹھی دھوپ میں پَر پھیلائے

گوری آئے پنگھٹ سے اٹھلائے اور شرمائے
جل کی گاگر خود چھلکے ہے، جوبن کی چھلکائے

پانی کی دو گگریں گوری اُن کو رکھ سستائے
جوبن سنگتی ہاتھ بٹاتا، اُلٹا بوجھ بڑھائے

پنگھٹ رستے پر جو ناریں گاگرنا چھلکائیں
روپ نگر کے سارے جوگی پیاسے ہی مر جائیں

جیسے سورج کی کرنوں سے پھل اندر رس آئے
ہم متوالوں کی نظروں سے روپ اس کا گدرائے

جوبن مایا اٹھ اٹھ کوکے دان بھی کر کچھ گوری
مُہریں باہر نکلی جائیں، بھرگئی روپ تجوری

روپ کسوٹی پر کس لے یا جوبن کانٹے تول
اتنی بات کہوں میں گوری پیت مری انمول

انگیا اندر تیرا جوبن ایسی گھات لگائے
جیسے تال کنارے بگلے بیٹھے سر نیوڑھائے

تیری چھاتی اوپر گوری جوبن کا سینگھار
جیسے سنگھاسن آ بیٹھیں دو جڑواں راج کمار

تیرا جوبن دیکھ کے ٹھٹکا گوری سوچ کا گھوڑا
تال کے اندر جیسے بیٹھا چٹے ہنس کا جوڑا

جوبن مایا چھاتی اوپر رکھ کر گوری سوئے
لاج کی چوکی ایسی چوکس موس سکے نہ کوئے

ساون برکھا اندر گوری ہنس ہنس کھڑی نہائے
ململ کی چولی سے جوبن رِس رِس باہر آئے

تھال پہ گوری تال جمائے اور گھڑے پہ تھاپ
کون سی ایسی مایا مل گئی بھولی اپنا آپ

کیسے اِس کھلیان کو کوئی کٹھیا اندر ڈھوئے
جھولی بھر بھر ڈھوئیں پریمی ڈھیری کم نا ہوئے

آج بھرا ہے گوری تیرے جوبن کا کھلیان
یہ ہی سمے ہے کر دے جو کچھ کرنا ہے پُن دان

تیرے کالے کُرتے کا جب گوری گلا کھُل جائے
پربت اوپر کچّی چٹّی برف کو بھی شرمائے

گھر انگنائی

مایا دیوی

پُرکھوں نے تو زور سے اپنے جیتا ہندوستان
ہم کو دیکھو ہار کے سب کچھ لوٹ آئے مردان

میں بھولا چرواہا تو پربت جنگل کی رانی
تیرے دیس میں آ نکلا ہوں او البیلی پٹھانی

روہیل کھنڈ سے چل کر جوگی پہنچا بیچ صوابی
جوگ تیاگا جب دیکھے وہ اس کے نین گلابی

ایک گھڑی کو چھب دکھلاتی گزری ایک پٹھانی
کیسا سمے تھا ایک نجر میں بن گئی جیون رانی

ٹوپی کی کیا بانکی ناریں گٹھری گٹھری روپ
سورج جیسے مکھڑے چمکیں سارے آنگن دھوپ

ٹوپی کی اک ناری تھی اور نام تھا اس کا مایا
ایک نجر میں بھر دی جھولی پلٹی من کی کایا

سندر سی اک ناری تھی اور سندر اس کا گاؤں
ناگن جیسی چال تھی اس کی مایا جیسا ناؤں

سات تھیں بہنیں اس ناری کی چار تھے اس کے بھائی
مت پوچھو اے پوچھنے والو کیسے جان بچائی

کتنا ہی چاہیں کھوج نہ پائیں دھرتی کے یہ لوگ
مایا دیوی میرا تیرا امبر کا سنجوگ

مایا کے میں سپنے دیکھوں مایا نام سُہائے
مایا میرے من کی دھڑکن کوئی بوجھ نہ پائے

مایا مایا ڈھونڈوں پرنتو پتھر مٹّی کیچ
مایا بیٹھی مسکائے ہے میرے من کی بیچ

میں مایا کا چاکر لوگو میں مایا کا داس
پیار سے دیکھے مجھ کو مایا ساری جیون آس

مایا میری آتما لوگو مایا میرا اَنگ
مایا کے کارن ہیں سچ مچ جیون کے یہ رنگ

مایا میری بُدّھی لوگو مایا میری بُوجھ
مایا میرے نین کی جوتی مایا میری سوجھ

مایا من منڈپ کی رانی مایا آنکھ کی جوت
ہوت ہوئے مایا کے کارن ہم جیسے نا ہوت

مایا جیون پھلواری ہے مایا پریت کا ہار
مایا دکھ میں ڈھال ہے لوگو رن میں ہے تلوار

مایا میرے سر کی پگڑی مایا میرا بانا
مایا میرے گھر کی شوبھا مایا نام سہانا

مایا میری کمر کا جمدھر مایا میری ڈھال
مایا میری پریت کیاری' پالے ہیرا لعل

مایا میرے انگ کی شِکتی مایا پریت کا انت
مایا جیسے رات دوالی جیسے روز بسنت

مایا ہیرے لعل سمیٹے اپنے چھپرکھٹ سوئے
ایک دوانہ راتوں جاگے بیٹھا گیت پروئے

تیری دیا سے پایا پربھو میں نے یہ سکھ چین
آنکھیں کھولوں پیار پہ اُس کے پیار میں کاٹوں رین

منڈی ہاٹ میں چلتے چلتے پرؔتو جب میں ہانپوں
اُس کی پریم چنریا اندر اپنا مکھڑا ڈھانپوں

مایا جوبن بندھن جانچے آنگن کھیلے لالا
پرؔتو بیٹھا دوہے لکھّے دیکھو پریم شوالا

دھرتی پر بھی ہوتا ہے آکاش پہ ہو جو ناتا
بھاگ نہ لکھّا ہوتا پرؔتو اس کے دوار نہ جاتا

ہیرا لعل

برگد سی بڑھوار ہو اُس کی جگ میں پھیلے ناؤں
آنگن میں اک کومل بوٹا سارے گھر میں چھاؤں

اُس کو کھِلتا دیکھ کے پرتو سارا دکھ مٹ جائے
آنگن اک گیندے کا بوٹا سارا گھر مہکائے

سچ پوچھو تو اس سے بڑھ کر کیسا کسی کا روپ
ہیرا لعل ہنسے تو جگ میں پھیلے سنہری دھوپ

ہیرا لعل کھلونا لے کر خوش ہو اور مُسکائے
سچ مانو تو میرا لوہو پلیوں ہی بڑھ جائے

دوسری تخلیقات

پرتوِ شب (غزلیں)

رین اجیارا (دوہے)

نوائے شب (غزلیں، دوہے، نظمیں)

ٹپے (پشتو لوگ گیت مع اردو ترجمہ)

کلیاتِ عطاؔ (تالیفِ کلامِ فارسی عطا اللہ خان عطاؔ)

پرتوؔ روہیلہ۔ شاعری و شخصیت (مجموعۂ مضامین مشاہیر)

سفرگشت (سفرنامہ امریکہ)

سفر دائروں کا (غزلیں، نعتیں)

دامِ خیال (کلیات)

آواز (نظمیں)

شکستِ رنگ (غزلیں)

اک دیا دریچے میں (حمد، نعت، غزل، نظم)